وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آخری مضامین یعنے

ملک کے جاں نثار مسلمانوں کے عملی غمخوار مصلح و ریفارمر مجتہد و مجدد پیشوائے ملت و امام وقت اسلام کے عاشق صادق قوم پر اپنا تن من دھن قربان کر دینے والے جواد الدولہ عارف جنگ

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں صاحب بہادر

کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ایف۔ آر۔ ایس

جسے

[illegible] تصوف کے

مالک و ایڈیٹر

ملک چنن الدین خلف الرشید ملک فضل الدین ککے زئی نقشبندی مجددی تاجر کتب

[illegible]

کوچہ ککے زیاں — بازار کشمیری

لاہور

بصرف زر کثیر بامحاورہ اردو ترجمہ کرا کر نہایت صحت سے چھپوایا

Title Ptd. at Photo Art Press, Lahore, Price Rs. 1-4-0 Design Registered.

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آخری مضامین

یعنی

ملک کے جان نثار مسلمانوں کے علمی غمخوار مصلح و ریفارمر مجتہد و مجدد پیشوائے ملت و امام وقت اسلام کے عاشق صادق قوم پر اپنا تن من دھن قربان کر دینے والے جواد الدول۔ عارف جنگ

آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں صاحب بہادر

کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ایف۔ آر۔ ایس

بانئے مدرسۃ العلوم علیگڈھ مرحوم و مغفور علیہ الرحمۃ

از ابتدائے یکم شوال ۱۳۱۴ ہجری المقدس لغایت ماہ ذیقعد ۱۳۱۵ ہجری

مرتبہ

(۱) جناب مولانا مولوی محمد امام الدین صاحب گجراتی سلمہ ربہ (۲) مولوی احمد بابا صاحب مخدومی لاہوری

جسے

اللہ والے کی قومی دکان مالک چنن الدین خلف ملک فضل الدین ککےزئی مجددی تاجر کتب نقشبندی

منزل نقشبندیہ

کوچہ ککےزئیاں ــــــ بازار کشمیری

لاہور

منصور پریس لاہور میں باہتمام لالہ شاہ مہر کی چھپوائی

قیمت فی جلد ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

نذر

مؤلفین کتب کسی خاص بات کو مدِنظر رکھ کر
اپنی تالیفات کسی نام آور شخص کے نام سے نامزد
کرتے ہیں۔ مگر میں اس کتاب کو قوم مسلمانان کے نام
پر معنون کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہ قوم
اس عنونہ کی کہاں تک قدر کرتی ہے۔
اور احسان مانتی ہے ؂

خاکسار
ملک چنن الدین خلف ملک فضل الدین ککے زئی
مالک اللہ والے کی قومی دکان۔ بازار کشمیری
لاہور

فہرست آخری مضامین مذہبی واخلاقی آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خان صاحب بہادر

کے۔ سی۔ ایس۔ آئی

مرحوم و مغفور

اردو ترجمہ کتاب روضۃ القیومیہ

مصنفہ

جناب صاحبزادہ بزرگوار حضرت مولانا خواجہ کمال الدین شیخ محمد احسان معصومی مجددی

یہ کتاب مستطاب حضرات قیوم اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات میں ایسی جامع اور مکمل ہے کہ اسکی مثل اور کوئی کتاب نہیں کتاب ہذا کے چار حصے ہیں ہر حصہ میں ایک ایک قیوم کے حالات بہ تفصیل ذیل درج ہیں :-

رکن اول } در احوال حضرت خزینۃ الرحمۃ محبوب سبحانی شہباز لامکانی امام ربانی مجدد الف ثانی قیوم اول رحمۃ اللہ علیہ مع احوال جملہ فرزندان و خلفائے آنجناب بہ تفصیل ہر سال قیومیت و مکاشفات و کرامات و حادثات و واقعات سلطنت وغیرہ ۔

رکن دوم } در احوال حضرت عروۃ الوثقی معصوم ربانی قیوم ثانی حضرت خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمۃ مع احوال جملہ فرزندان و خلفائے آنجناب بہ تفصیل ہر سال قیومیت و مکاشفات و کرامات و حادثات زمانہ و واقعات سلطنت وغیرہ ۔

رکن سوم } در احوال حضرت امام حزب اللہ حجۃ اللہ قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبند ثانی علیہ الرحمۃ مع احوال جملہ خاندان و خلفائے آنجناب بہ تفصیل ہر سال قیومیت و مکاشفات و کرامات عالیہ مع واقعات و حادثات سلطنت وغیرہ

رکن چہارم } در احوال حضرت پیر دستگیر قیوم زمان خلیفۃ اللہ سلطان الاولیا قیوم رابع خواجہ محمد زبیر رحمۃ اللہ علیہ مع احوال جملہ فرزندان و خلفائے آنجناب بہ تفصیل قیومیت ہر سال و مکاشفات مع واقعات و حادثات سلطنت وغیرہ

اس کتاب گوہر نایاب کو بڑی تلاش و تجسس سے بہم پہنچا کر اردو ترجمہ کرا کے چھپوایا گیا ہے امید ہے کہ عاشقان دربار مجددیہ و دلدادگان سرکار معصومیہ خاکبوسان حضرت حزب اللہ خدامان بارگاہ خلیفۃ اللہ اسے حرز جاں بنائیں گے ۔

خوشخط اعلےٰ کاغذ قیمت جلد اول ہر دو حصہ ۳ جلد دوم ہر دو حصہ ۳ مجلد ہوگی

اردو ترجمہ کتاب حضرات القدس دو حصہ

نایاب کتاب جعفر الاحمد بدر الدین ابراہیم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی (جو حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے بڑے رتبہ کے خلفا میں سے ہیں) دو حصوں میں تصنیف لطیف ہے ۔ اس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے لیکر تمام پیران عظام خاندان عالیہ نقشبندیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مفصل حالات نہایت تحقیق سے لکھے ہیں جو ہر ایک نقشبندی کے گھر میں موجود رہنی چاہئے چونکہ یہ کتاب بدیں فیض انتساب نہایت کمیاب تھی اور خاندان نقشبندیہ کے تمام بزرگ حلقہ بگوش اس کے شائق تھے اس لئے بڑے تجسس سے بہم پہنچا کر اور تین سال کی لگاتار محنت سے ترجمہ کرا کر نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے اعلےٰ درجہ کے ولایتی کاغذ پر بڑی خوشخط طبع کرائی گئی ہے اور دونوں حصے الگ الگ ہیں اگر آپ کو حضرات عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے مفصل حالات اور انکی کرامات ان کے مکاشفات ملاحظہ فرمانے ہیں تو اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں یہ کتاب ضرور دیکھ کر پڑھیں اور ان بزرگوں کے فیضان باطنی سے بہرہ اندوز ہوں اور چھپانے کیلئے دعائے خیر فرمائیں علاوہ محصول ڈاک قیمت حصہ اول ۳ حصہ دوم ۳

المشتہر اللہ والے کی قومی دکان پروپرائٹر حسن الدین تاجران کتب و مالک رسالہ اسرار تصوف کشمیری بازار لاہور

دیباچۂ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم

بعد حمد و نعت - بر آرائے[1] رزینِ فضلائے عصر و عقلائے دہر مخفی نہ رہے - کہ تہذیب الاخلاق کے نہایت پاکیزہ اور دل پر اثر کرنے والے مضامین کی صوری و معنوی خوبیاں - اُس کے پاک اثر جو ناظرین کی طبائع پر پڑتے رہے - مثلاً اہل ہند و پنجاب کو غفلت کی خواب سے جگانا - جہالت کے قہّار سمندر سے نکالکر علمی روشنی کے وسیع میدان میں لانا - اُردو علم ادب میں ایک تازہ روح پھونکنا اور از سرِ نو جان ڈالنا - اُن اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کو جو کالی گھٹاؤں کی طرح اسلام کے نورانی چہرے پر چھا گئے تھے - اپنے براہین اور دلائل سے دُور کر کے اُس کا اصلی اور حقیقی پاک صاف چہرہ دکھا دینا - امورِ تمدن اور معاملات معاشرت کو بتا دینا وغیرہ ایسی ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکیاں ہیں - کہ نہ صرف موجودہ صدی یا چند آیندہ صدیوں کے لئے ہی عمدہ یادگار رہینگی - بلکہ جو جو قوم کی عالمگیر اصلاحات اِس صحیفہ فطرۃ کے انسان کامل (مُصنّف علیہ الرحمۃ) نے دنیا میں کر دی ہیں - وہ دیگر مذاہب کے احباب کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً ہر زمانہ اور ہر آن اپنا ممنون احسان و مرہون منّت رکھینگی - لیکن سب سے بڑھ کر بعض دلوں کے لئے تو (گو کہ ان کی تعداد قلیل ہی ہو) اس برگزیدۂ آفاق بانداق تہذیب الاخلاق کی ایسی ہی مثال تھی - جیسے تشنگانِ حجاز کے لئے آبِ زلال - اور دل دادگانِ تہذیب روحانی و جسمانی کے لئے معشوق شیریں جمال یا یوں کہا جاوے کہ گم گشتگانِ بادیہ ضلالت کے لئے خضر فرخندہ خصال ۔

اس کے کارناموں کے بیان میں ہزاروں قلمیں اور لاکھوں زبانیں عذب البیان اور رطب اللسان ہو چکی ہیں - اور روشن ضمیران اور زندہ دلانِ ہند و پنجاب کی مسلم الثبوت رائے قرار پا چکی ہے - کہ

[1] گراں مایہ - استوار (مخدومی)

اپنے وقت کا یہ ایک ہی نامور اور لاثانی علمی رسالہ تھا۔ جس نے آفتاب عالمتاب کی طرح افق مشرق سے طلوع پاکر اپنی زرین شعاعیں پنجاب اور ہندتک ہی محدود نہیں رکھیں۔ بلکہ عالم عالم اس فیض سے مستفیض اور جہان جہان اس نور سے منوّر +

پس اس احقر العباد اور ہیچ میرز کی کیا مجال ہے کہ اس باب میں اُن بزرگان قوم کا ایک ہزارواں حصّہ بھی لکھ سکے۔ نہ تہذیب الاخلاق کو کسی تعارف کی ضرورت ہے۔ اور نہ اپنی تعریف و توصیف کی کچھ حاجت۔ بلکہ یہ مجسّم خوبی اور سراپا محبوبی اپنی آپ تعریف ہے ع

حاجتِ مشاطہ نیست روے دلارام را

کسی شاعر باکمال نے شاید یہ شعر اسی کی شان میں کہا ہے ؎

شوقِ زلفِ تو نہ تنہا دلِ ما شیدا کرد

ہر کہ ایں سلسلہ را دید جنوں پیدا کرد

یہ ذخیرۂ دانش وسرمایۂ بینش زمانہ حال کی دینی اور دنیوی بہتری کے لئے ہی عزیز تر نہیں ہے بلکہ جوں جوں ضروریات آنے والی نسلوں کو پیش آتی جاوینگی۔ خود بخود عزیز ترین ہوتا جاویگا۔ ملکی اور قومی لائبریریوں کی زیب وزینت ہوگا۔ اسلامی مجالس میں اس کے نہایت شوق سے تذکرے ہؤا کرینگے۔ فاضل نامہ نگاران اس سے سند لیا کرینگے۔ اردو لٹریچر کے سیکھنے والوں کا حرزِ جاں اور روحِ رواں ہوگا +

ابتدائی سات سال کی شبِ وصل کے بعد جب یہ قمر رخصت ہونے لگا۔ تو اس کے دلدادگان یعنی پیاری تہذیب کے رشید شاگردوں نے اس کے فراق میں اپنا نالۂ سنخیز ماہ وتیر تک پہنچا دیا۔ اور ملکی اخبارات میں غایت درجہ کا رنج وملال ظاہر کیا۔ جو اس کی سچی اور بے لاگ قومی محبت کا عینی ثبوت تھا۔ اور واقعی اس بے نظیر اور لاثانی۔ اخلاقی۔ تمدّنی اور مذہبی اسلامی رسالہ کا ایسی حالت میں کہ ابھی ابھی مسلمانوں کی قوم غفلت کی خمار آلو دخواب سے بیدار ہو کر قومی قومی کہنا سیکھی تھی۔ بند ہو جانا قوم کی پرلے درجے کی بدبختی اور کم نصیبی کا باعث تھا۔ چنانچہ اکثر احباب اہل اسلام جو شکستہ دل اور خستہ خاطر ہو گئے تھے۔ عجز ونیاز کے ساتھ سرسید مرحوم مغفور کی خدمت میں گذارشیں کرنے لگے۔ کہ دوبارہ اس کو جاری کیا جاوے +

چنانچہ ماہ رمضان کے اخیر ۱۳۰۰ء نبوی مطابق ۱۲۹۳ھ ہجری کو بند ہوا تھا۔ اور ۱۳۱۰ء نبوی مطابق ۱۲۹۶ھ ہجری یعنی تین برس کی مدت کے بعد دوبارہ جاری ہؤا۔ اور کس زور وشور اور آب وتاب سے نکلا۔ کہ پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ یعنی دوئی کے حجاب کو دُور کر کر آواز بلند کہدیا۔ کہ اسلام اور فطرۃ دو نہیں ہیں۔ جس کا دل چاہے ایک کو دوسرے سے ملا کر کھرا کرلے۔ اور جس کے دل میں ہماری طرف

سے کچھ غبار ہے۔ ہم کو نیچری کہکر نکال لے۔ اس دوسری بار کی طرز و تحریر۔ رنگ ڈھنگ۔ نرالا اور انوکھا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ابھی پورے اڑھائی برس بھی گذرنے نہ پائے تھے۔ کہ قومی اور اسلامی کاموں کے اس قدر انبار آکر سرسید مرحوم پر پڑے کہ آخر کو خود بہ نفس نفیس اس کی خبرگیری نہ کرسکے۔ اور اور کسی کے دماغ میں وہ سرسبزی اور فطرۃ کے راز کہاں تھے۔ جو سرسید مرحوم کو قادر مطلق نے عطا فرمائے تھے۔ کہ قائمقامی کا حق ادا کرسکتا۔ غرض تہذیب الاخلاق پھیکا پڑ گیا۔ اور سرسید مرحوم کے دوستوں نے اس کا افسوس بذریعہ اخبار سفیر ہند امرت سر اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ تو آنجناب نے اس امر کو تسلیم کرلیا اور لکھ دیا۔ کہ فی الحقیقت تہذیب الاخلاق کا ایسا ہی حال ہو گیا ہے۔ اور چونکہ دیگر اسلامی نیز ابھی کے کاموں سے مجھے فرصت نہیں ملتی۔ اس لئے اسے بند کیا جاتا ہے۔ اور دوستوں کو افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اُن کو **تفسیر القرآن** اس کا نعم البدل ملیگی +

اب تہذیب کے فریفتوں نے یقین کرلیا۔ کہ اس عقل افزا دلربا معشوق کا نورانی چہرہ پھر کبھی ہماری آنکھوں کو روشن نہیں کریگا۔ (ان اڑھائی سال کی جلدیں بھی موجود ہیں۔ اور موجودہ اور آیندہ اسلامی دنیا کو سوا اس کے کوئی چارہ نہ ہوگا۔ کہ اپنے گھروں میں انہیں عزت اور تعظیم کے ساتھ رکھیں۔ اور ان کا مطالعہ کیا کریں) +

پھر نہ تو سرسیدمرحوم کے کسی دوست کو یہ جرأت ہوئی۔ کہ سہ بارہ اس کے اجرا کی تحریک کرے۔ اور نہ (جہاں تک میری یادداشت ہے) کسی ملکی اخبار میں اس باب میں کچھ لکھا پڑھا گیا مگر "ناظرین باتمکین" قوم کی خوبی اقبال کا ستارہ ایک دفعہ اور اوج سطوت پر چمکنے کو تھا۔ جس میں وہ یار دیرینہ (تہذیب الاخلاق) ابھی ایک بار اور بھی اپنا جمال دکھلائے اور نئے کرشمہ و ناز اور انوکھے عشوہ و انداز سے ہمارے سامنے جلوہ دکھلائے۔ اور اپنی علمی تبحر اور قدرتی خوبیوں سے جو خداوند تعالےٰ نے اس کے بانی مبانی کی طبیعت میں ودیعت کر رکھی تھیں۔ اُن کو کام میں لاکر **قرآن مجید** کے حقائق اور معارف نیچرل تفسیر سے ہمیں سمجھلائے۔ مگر اس خوشخبری کے ظاہرا کسی قسم کے آثار نمایاں نہ تھے۔ کہ یکایک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسہ میں جو دسمبر ۱۸۹۳ء میں بمقام علیگڈھ منعقد ہوا۔ شمس العلماء حافظ مولوی نذیر احمد دہلوی کی روانئے طبع کے مواج سمندر کی موج نے اِدھر پلٹا کھایا اور تہذیب الاخلاق کی چھڑ گئی۔ اس ہندوستان کے سحبان وائل میں خدا جانے خطیب بغدادی کی پاک روح نے حلول کیا ہے۔ یا جعفر طیار ہی داخل ہو گیا ہے۔ سامعین کو اپنے ہاتھ کا کھلونا بنانا انہیں کا کام ہے +

غرض مولٰنا موصوف نے اپنی طلاقتِ لسانی اور جادو بیانی کے سمند خوش خرام کو فصاحت اور بلاغت کے میدان میں اس درجہ تک جولانی دی۔ کہ حاضرین جلسہ کو دنگ ہی کردیا۔ اور بیچارے

سرسید مرحوم کو کوئی چارہ نہ رہا۔ بجز اس کے کہ معترف ہو کر صدق دل سے اپنے اس قصور کا اقرار کریں۔
چنانچہ اسی سنہ ہائے کے اخیر ۱۳۲۴ء نبوی مطابق ۱۳۱۱ء ہجری قریباً گیارہ برس کے عرصہ کے بعد اپنے جگر پارہ پارہ کو سہ بارہ قوم کے نظارہ کے لئے پیوند کرنا چاہا۔ جیسا کہ خود حضرت نے اعلان کی پیشانی قائم کی تھی ؎

آمادہ گشتہ ام وگر اینک نظارہ را   پیوند کردہ ام جگر پارہ پارہ را

اور تیسری بار یاس سے آخری بار تہذیب الاخلاق پھر صفحۂ ہستی پر آیا۔ مگر اس دفعہ ایک اور ہی قسم کے عشوے اور ادائیں۔ غمزے اور ناز و انداز ساتھ لیکر آیا۔ اب کے مضامین سوائے معدودے چند کے نری تفسیر القرآن ہی تھے جس کی مسلمانوں کو کمال درجہ کی ضرورت اور اشد درجہ کی حاجت تھی۔ مگر افسوس ہے اور صد افسوس ان مسلمانوں پر جنہوں نے ایسے بیش قیمت اور لاثانی جواہرات کی کماحقہٗ قدر نہ کی اور نہ قلمی امداد ہی دی۔ اور تہذیب الاخلاق آخری تین سال جاری رہکر اخیر ماہ رمضان ۱۳۲۶ء نبوی مطابق ۱۳۱۴ء ہجری کو اپنا قالب تبدیل کر کر علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ساتھ شامل ہو گیا۔

الحق کہ یہ دار ناپائدار (دنیا) گذشتنی اور گذاشتنی ہے۔ نہ دل بستنی اور دل آویختنی۔ جو تنکا عرش بریں تک بلند ہوا۔ آخر اسے بھی فرش زمین پر آنا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ اور كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کا ہر کہ و مہ پر دور دورہ ہے ؎

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید   زجام دہر مئے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کا دن بھی آپہنچا۔ جو قوم کی آرزوؤں اور امیدوں کا خاتمہ کرنے والا تھا۔ اور اس وحشت اثر خبر کو شہرت ہونا تھا۔ کہ آج وہ ملک کے جاں نثار اور مسلمانوں کے علمی غمخوار۔ مصلح و ریفارمر مجتہد و مجدد پیشوائے ملت و امام وقت۔ اسلام کے عاشق صادق قوم پر اپنا تن من دھن قربان کر دینے والے سرسید اس دار فانی سے رحلت فرمائے عالم جاودانی ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

مولوی سید میر حسن سیالکوٹی فرماتے ہیں "عزیزو! حضرت (سرسید مرحوم) ماہ ذی الحج مبارک کی پانچویں تاریخ ۱۲۳۲ء ہجری میں پیدا ہوئے۔ اس مہینے کو ہمارے ملک میں بڑی عید کا مہینہ کہتے ہیں۔ گویا سرسید مرحوم کا تولد مسلمانوں کے لئے بڑی عید تھا۔ اور پھر حضرت ممدوح کی وفات حسرت آیات ماہ ذی القعدہ کی پانچویں تاریخ کو ۱۳۱۵ء ہجری میں ہوئی۔ اس ماہ کو

ہمارے ملک میں خالی کا مہینہ بولتے ہیں۔ گویا ملک کو اس بڑی عید کی خوشی سے خالی کر گئے۔

(ناسخ) ؎
کر گیا ہے مری آغوش کو جاناں خالی
اس مہینے کو بجا کہتے ہیں انساں خالی

پھر ان کے مغفور و مرحوم ہونے کے لئے مادہ غُفِرَ لَہٗ کیا ہی عمدہ ہے۔ گویا پیدا ہوئے تو مسلمانوں کے حق میں بڑی عید کی خوشی۔ وفات ہوئی تو ملک خالی ہو گیا اور حضرت کا خاتمہ مغفرت پر ہوا[۱]+

چونکہ سرسید ملک ہند ہی میں پیدا ہوئے۔ ہند ہی میں وفات پائی۔ اور اسی ملک میں حضرت کی نعش مبارک مدفون کی گئی۔ اس لئے مولانا موصوف نے ہندی تاریخ سمت ۱۹۵۵ اس فقرہ سے نکالی ہے۔

وفات حسرت آیات سرسید احمد+

پس سرسید مرحوم کے وجود باجود کے ساتھ ہی آنے والے مضامین تہذیب بھی ہم سے ابدی جدائی کر گئے۔ جن کی حسرت کبھی ہمارے دل سے دور نہ ہوگی ؎ (ذوق)

کیا حبیب کو مجھ سے جدا فلک نے اگر
نہ کر سکا مرے دل سے غم حبیب جدا

جدا نہ درد جدائی ہو گر مرے اعضا
حروف درد کی صورت ہوں اے طبیب جدا

آخری مضامین ماہ رمضان ۱۳۱۴ھ نبوی سے لے کر۔ خاص کر وہ مضامین جن کی پیشانی پر لفظ تہذیب الاخلاق لکھا ہوا ہے۔ بہت تھوڑے احباب نے اُن کو دیکھا اور اُن سے فائدہ حاصل کیا ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ علیگڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ جس کی بہت تھوڑی کاپیاں نکلا کرتی تھیں۔ اور جس کا سالانہ چندہ اس قدر زیادہ تھا کہ ایک متوسط درجہ کی حیثیت کے مسلمان اُن کو خرید نہ سکتے تھے۔ پھر ناظرین خوب جانتے ہیں کہ ہندو پنجاب کے کم لوگ ہی ایسے شوقین ہوتے ہیں۔ جو اخباروں کے فائیل اپنے پاس جمع رکھیں۔ پس میرے اُس اخلاص نے جو سرسید مرحوم سے مجھے تھا۔ اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ جہاں تک ممکن ہو۔ ان مضامین کو بہت جلدی چُن کر ایک کتاب کی صورت بنا دیا جائے۔ تاکہ روشنضمیر مسلمان اس سے فائدہ اٹھاویں+

چنانچہ حسب الارشاد منشی فضل الدین صاحب تاجر کتب قومی لاہور (جو سرسید مرحوم کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ اور جنھوں نے زر کثیر صرف کر کر اس برگزیدہ سلسلہ تہذیب الاخلاق کو از سر نو قسم[۱] چھپوا کر مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اور جن پر سرسید مرحوم نے مندرجہ حاشیہ[۲] ریمارک کیا تھا) اور بصلاح و صوابدید مولوی احمد بابا مخدومی لاہوری اس کی جمع و ترتیب شروع کی +

---

[۱] اس معنی آفرینی پر آفرین۔ سبحان اللہ (خاکسار احمد بابا مخدومی لاہوری)

[۲] منقول از صفحہ ... علیگڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ ۱۸۹۵ء جلد دوم مجموعہ مضامین تہذیب الاخلاق۔

اس سے پہلے ہمارے مکرم دوست منشی فضل الدین صاحب تاجر کتب قومی لاہور نے ایک (باقی صفحہ ۶)

ان مضامین کے جمع کرنے کی خاطر مجھے چند بڑے بڑے شہروں میں جانا پڑا۔ تو میں نے بہت محنت سے ان کو بہم پہنچایا۔ تاکہ برادران اہل اسلام ان جواہرات سے بیشمار فائدے حاصل کریں کیونکہ بقول مولوی احمد بابا مخدومی کے یہ مضامین بھی جن میں سے اکثروں کو دوسرے الفاظ میں تفسیر القرآن لکھنا چاہئے۔ جیسے کہ کالجوں اور سکولوں کے نوجوانوں کے لئے اکسیر اعظم کا کام دینگے۔ ویسے ہی ہمارے مقدس و بزرگ علمائے اہل اسلام کے درسوں کے حلقوں میں جہاں تفسیر القرآن سرسید اور دیگر تفاسیر کھلتی ہیں۔ ضرور تاکھلا کرینگے +

جس قدر سرسید مرحوم کے پولٹیکل لکچرز اور اسپیچیں ہیں۔ اُن کو علیحدہ کتاب میں لیا گیا ہے۔ جو عنقریب انشاء اللہ تعالےٰ شائع ہوگی۔ اور جب یہ مشورہ ہم نے جناب حافظ مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر مشن کالج سیالکوٹ کی خدمت میں پیش کیا۔ تو انہوں نے بھی اس پر صاد کیا +

سب سے آخری مضمون ناتمام جس کی پیشانی ہے **ازواج مطہرات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم** اگر پورا ہو جاتا۔ تو اپنا آپ ہی ثانی ہوتا۔ مگر پیک ایزدی نے اپنے مالک حقیقی کے حکم کی تعمیل کی۔ اور اس مضمون کا باقی حصہ جو ابھی مصنف مرحوم کے دل و دماغ ہی میں تھا۔ زبان قلم پر نہ آسکا۔ چنانچہ خود سرسید مرحوم اپنے ایک خط میں جو ۱۱۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو جناب حافظ مولانا مولوی سید میر حسن صاحب موصوف کو تحریر فرمایا تھا لکھتے ہیں :۔

"ان دنوں میں ایک بہت نازک اور بڑے امر پر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں یعنی ازواج مطہرات رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ رسالہ چھپے گا تو مجھے یقین ہے کہ کسی کے دل میں کوئی شبہ باقی نہیں رہیگا +

ناظرین غور کرو۔ اس قابل ادب ولائق تعظیم نیک دل مسلمان سے زیادہ سچا اور وعدہ وفا کون ہو سکتا ہے جس کا عالم شباب۔ کہولت اور شیخوخت۔ اسلامیوں کی خیر خواہی میں گذرا اور پھر خاتمہ بالخیر اسلام کی حمایت اور ہمدردی میں ہوا۔ ہاں ع بریں زاد و بریں بود و بریں مُرد +

میری آخری التجا اس کتاب کے پڑھنے والوں کی خدمت میں یہ ہے۔ کہ وہ سرسید مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کریں "اَرحَمُ الرَّاحِمِین اللہ پاک" سرسید مرحوم کو اپنے حبیب احمد مجتبیٰ رسول کریم محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی بدولت اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین +

۱۵ دسمبر ۱۸۹۸ء — احقر العباد امام الدین گجراتی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵) ایک مجموعہ ان تمام مضامین کا چھاپہ تھا۔ جو نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی سات برس کے قریب تک تہذیب الاخلاق کے پرچوں میں لکھتے رہے ہیں۔ اب انہوں نے اس کی دوسری جلد چھاپی ہے۔ اور اس میں ہفت سالہ سید احمد خاں کے جو مضامین وقتاً فوقتاً تہذیب الاخلاق میں چھپتے رہے ہیں۔ نہایت خوبی و ترتیب سے جمع کر دیئے ہیں۔ اور جلد دوم تہذیب الاخلاق سے اس کو موسوم کیا ہے۔ اس جلد کے ۶۲۰ صفحے ہیں اور صفائی اور خوبی سے چھاپے گئے ہیں۔ ہم اس کی نسبت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں لکھ سکتے کہ ہمارے مکرم دوست منشی فضل الدین صاحب نے نہایت عمدگی سے وہ سب مضامین جمع کئے ہیں۔ جو لوگ مضامین تہذیب الاخلاق کو پڑھنا چاہتے ہوں۔ ان کے لئے یہ مجموعہ نہایت بکار آمد ہے۔ قیمت اس کی تین روپیہ ہے

دیباچۂ دوم

کون نہیں جانتا کہ آج سے ستر اسی برس پہلے تک مسلمانوں میں ایک جمود و خمود اور عام طور پر سکون کی حالت طاری تھی۔ قرآن کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے رٹنا کافی جانا گیا تھا۔ کوئی عمرو کا تنبیدا تھا۔ کوئی بکر کا۔ مدارِ عمل مجموعۂ فتاوے پر رہ گیا تھا۔ قرآن بالائے طاق قسم کھانے کے لئے تھا۔ اس کے سمجھنے کو بیعقلی اور نہ سمجھنے کو دانش مندی تسلیم کیا جاتا تھا +

مسلمانوں کی وہ حالت تھی۔ کہ خدا کسی کو نہ دکھائے۔ دین بیضا و مذہب اکمل اسلام کی وہ صورت بن گئی تھی کہ خدا کرے کافر بھی نہ پائے۔ اسی حالِ پُر ملال میں خدا کی غیرت حرکت میں آئی۔ اور اُس نے ہمیں میں سے خاک تاریک ہند سے ایک شخص کو جو مزاج کا خاکسار اور ملک و ملّت کا بے لوث۔ سچّا۔ صحیح الدّماغ غم خوار تھا جھٹکا دے کر جگا دیا۔ جس کی بدولت ساکنانِ خاکِ دامن گیر ہندوستان جنّت نشان نے اقصائے عالم اسلامی کی جملہ دینی ملکی اور علمی اصلاحات و ترقیات کی علم برداری کی قابلیّت حاصل کی +

وہ کون! جناب فضیلت انتساب عالی مقام سیّد السادات الکرام۔ نجم الهند والاسلام سرآمد محدّثین زمان۔ بر آمد متکلمین پیشنیاں و پیشینیاں۔ مفسر القرآن جواد الدولہ عارف جنگ آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خان۔ فردوس مکان۔ خلد آشیان۔ علیہ الرحمۃ والغفران

سلامٌ علے مرقدٍ نام فیہ ۔۔۔ امامٌ یباہی بہ الملک والدین
امامِ زماں ہادیٔ جنّ[1] وانساں[2] ۔۔۔ حریم ورش قبلہ گاہ سلاطین[3]

جس کے انفاس قدسی کی تاثیر سے عظام رمیمہ میں جنبش ہی نہیں ہوئی۔ بلکہ مُردے جی اُٹھے۔ مخالفین خطف البصار سے اور منکرین دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کی بھرمار سے مرمٹے

ذَالِكَ لَاٰيَةً لِمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ ۙ وَيَحْيٰي مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ؕ

اس مرد میدان فصاحت۔ مجدّد دین و مصلح تمدّن و معاشرت کی مساعی جمیلہ فلاح سود و بہبود قوم مسلمانانِ ہندوستان کے حق میں بار آور ہوئیں۔ جس کے واسطے وہ جگر گوشۂ بتول و آل رسول عمر بھر دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے سر توڑ کوششیں کرتا رہا۔ وطن سے بے وطن ہؤا۔ خویش و بیگانے۔ اپنے اور بیگانے کا ہدف تیر ملامت بنا۔ سختیاں سہتا رہا۔

---

[1] ناشائستہ۔ روستائی۔ [2] شائستہ۔ شہری۔ [3] مدبران و حکام سلطنت +

بُرے بول سنتا رہا۔ کبھی سودائی بنا۔ کبھی مجنون۔ پر حرف شکایت لب تک نہ لایا۔ کہا تو یہی کہا کہ رَبِّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ اُس نے سوتی قوم کو غفلت کی نیند سے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا۔ برسوں کے بھولے ہوؤں کو مشعل ہدایت سے نور و ظلمت کا فرق دکھا کر راہ راست پر لایا۔ کبھی نرمایا۔ کبھی گرمایا۔ کبھی ملاطفت و ملالت انگیز سے کام لیا۔ اور کبھی ملامت ظرافت آمیز سے جوش دلایا۔ اور پردۂ جہل و ضلالت ہٹا کر اُنہیں انوار علوم حقّہ سے فیض یاب کیا +

ترّی زباں بھی سیّد زبانِ اُردو ہے ترا بیاں بھی آخر بیان اُردو ہے
کلام تیرا یہ گویا کہ جان اُردو ہے سخن ہے تیر ترا اور کمان اُردو ہے

وہی ہیں لفظ جو لاتے ہیں سب عبارت میں
مگر ہے فرق شب و روز کا فصاحت میں

پس جن دلوں میں نرمی و گرمی تھی۔ جن کے چراغ قلوب میں اثر پذیری کا تیل تھا۔ وہ راہ پر آ گئے اور منور ہو گئے۔ جو سمجھنا تھا سمجھ گئے۔ سلیم القلب اور مستقیم الطبع لوگوں میں سخن شناسی اور نکتہ فہمی کا ذوق پیدا ہو گیا۔ اور سرچشمۂ ہدایت ربّانی اور تعلیمات حقّہ قرآنی کے جن کے حق میں قول سبحانی لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ وارد ہے۔ والہ و شیدا ہو گئے +

اُس حکیم امت اور سالک راہ و رسم منزل نے الہام ایزدی سے سمجھ لیا تھا۔ کہ پُرانے ہتھیار۔ نئے اسلحہ آتش بار کے مقابلے میں بے کار ہیں۔ نہیں چلتی توپوں میں تلوار ان کی تو بفحوائے آیہ کریمہ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ اسلوب جدید و طرز نوی کی بنیاد ڈالی +

تہذیب الاخلاق کے بند ہونے کا سر سیّد کو نہایت قلق تھا۔ جس کو انہوں نے میرے دو خطوں کے جواب میں درد انگیز الفاظ میں ظاہر کیا ہے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اے واقف راہ و رسم منزل!

آپ کا مضمون زیر عنوان تہذیب الاخلاق نظر سے گذرا۔ پڑھ کر بڑا رنج پیدا ہوا۔ اور رنج پیدا ہونے کی بات ہے۔ ابھی تھوڑا عرصہ گذرا ہے۔ کہ اس پرچے کے جاری ہونے کی خبر سن کر خوشی ظاہر کی تھی +

مجھے اس امر کا بڑا افسوس ہے کہ اتنے بڑے ملک ہندوستان میں اب تک دو سو آدمی بھی اس مذاق کے پیدا نہیں ہوئے! میں سمجھے بیٹھا تھا۔ کہ میرے زمانے کا تہذیب الاخلاق بڑی تعداد میں چھپتا اور تقسیم ہوتا ہو گا۔ آپ کی اس تحریر سے میرا خیال غلط ثابت ہوا + میں کسی دوسرے کا حال تو جانتا نہیں۔ اور نہ کسی کے دل کی کیفیت سے اطلاع ہو سکتی ہے

ا؎ از احمد مخدومی

لیکن میرا تو یہ حال ہے کہ ماہ قمری کا نصف گزرنے پاتا ہے۔ کہ تہذیب کے انتظار میں بے قرار دن
دن اور رات رات شمار کرنے لگتا ہوں۔ اختتام ماہ کے قریب جو حال ہوتا ہے۔ اس کا یہ شعر شاہد
ہے۔ ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک — آتش شوق تیز تر گردد

رات ہوتی ہے تو کہتا ہوں صبح کی ڈاک میں پرچہ آئیگا۔ وہ وقت گزر جاتا ہے تو شام کی ڈاک کا
منتظر رہتا ہوں۔ اور جب تک پرچہ نہ مل جائے۔ دل مشتاق دیدار کو صبر و قرار نہیں آتا۔ اور پرچہ آ
جانے پر طبیعت کیسی ہی ناساز کیوں نہ ہو۔ پڑھے بغیر تسکین نہیں ہوتی ؀

تہذیب الاخلاق وسیلہ ہے آپ سے ماہوار گفتگو کرنے کا۔ آپ سے نصف ملاقات کا
فطرت کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کا۔ پیارے خدا کے ذکر۔ پیارے رسول کی یاد کا ؎

مزا آتا ہے باتوں میں خدا کی — بھلی لگتی ہیں باتیں مصطفٰے کی!
ہوئی باتوں میں منزل مفت کھوٹی — کہانی ہے بڑی اور رات چھوٹی

اگرچہ مجھے آپ کی قلم سے نکلے ہوئے مضامین بھاتے ہیں۔ لیکن تفسیر کے پورا کئے جانے کی
نظر سے میں نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ آپ ہر ماہ میں صرف ایک آدھ مضمون پر اکتفا کرکے
باقی وقت تفسیر پر خرچ کریں۔ اور جس طرح بن پڑے۔ اُس کو پورا کریں۔ مگر کیا ہوا۔ ان بہت سے
دوستوں کو جنہوں نے مضامین لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اس تمہیدی اشتہار میں جو ۱۴ فروری ۱۸۹۴ء
کو آپ نے چھاپ کر تقسیم کیا تھا۔ اس میں بڑے بڑے نامی اور قابل قدر علماء کے اسمائے
گرامی درج ہیں۔ کیا اُنہیں اپنے وعدے فراموش ہو گئے ہیں؟ اور وہ آپ کے نیچری دوست کیا
ہوئے۔ جو نیچرل فلسفہ کو نہایت ہی عمدہ جانتے ہیں۔ اور ڈاروِن کی تھیوری (نظریہ) کے برابر
چلتے ہیں۔ برادری سے خارج کئے جانے کے ڈر میں ایسے آئے۔ کہ چُپ پیر کا روزہ رکھ لیا۔ یا یہ
کہنے کا حکم ہوا ہے۔ کہ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ؀

میں تو جانتا ہوں کہ یہ بھی ہماری عملی قوت کے ضعف کا نتیجہ ہے۔ کہ یہ چھوٹا سا پرچہ بیس
تیس صفحوں کا بھی نہیں چل سکتا۔ خوشا بحال اہل انگلستان کہ جو نائینٹینتھ سنچری۔ ریویو آف ریویوز
اور کوارٹرلی ریویو جیسے نہایت اعلےٰ درجے کے طبیعیہ۔ معاشریہ۔ تمدنیہ۔ فلسفیہ۔ اخلاقیہ۔
سیاسیہ۔ علمیہ اور حکمیہ مضامین پر مشتمل رسالے اور مخزن نکالتے ہیں۔ مجھے رشک آتا ہے
کہ ہمارا تہذیب الاخلاق بھی کیوں ویسا ہی نہ ہو! ؀

تفسیر کا پورا ہونا بڑا ضروری ہے۔ مگر تہذیب الاخلاق کا جاری رکھنا بھی لابد ہے۔ اس سے
مسلمانوں کی نہایت اہم اغراض مذہبی و دنیاوی وابستہ ہیں۔ اور اس کے چھوٹے چھوٹے

آرٹیکل بڑی بڑی ضخیم مجلدات کا فائدہ دیتے ہیں +

پس نظر بریں حالات و وجوہ میری التماس ہے۔ کہ آپ ایک سال اور امتحاناً تہذیب کو جاری رکھیں۔ اور دوستوں یاروں کو اس کے جاری رہنے کے واسطے کوشش کرنے کی ہدایت فرمائیں +

سرسید نے جواب دیا کہ

مخدومی مکرمی۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ جو نوازش اور عنایت آپ نے اپنے عنایت نامے میں فرمائی ہے۔ اور جو قدر دانی اور قدر افزائی تہذیب الاخلاق کی کی ہے۔ اس کا میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تہذیب الاخلاق کے بند ہونے کا مجھ کو بھی نہایت افسوس ہے۔ مگر افسوس ہے کہ میری ہمت ٹوٹ گئی ہے۔ اور بمقتضائے عمر اور بعض عوارض سے میں اپنے میں تہذیب الاخلاق جاری رکھنے کی اب قوت نہیں پاتا۔ اور ان وجوہ سے کسی طرح بعد رمضان وہ جاری نہیں رہ سکتا۔ مجھ کو افسوس ہے کہ میری اس تحریر سے آپ کی خاطر عاطر کو کچھ ملال ہوگا۔ مگر جو امر میری قدرت سے خارج ہو گیا ہے۔ اس کے عوض کرنے سے بھی مجبور ہوں۔ آپ کی عنایت اور مہربانی کا میں دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور امید ہے کہ آپ کی عنایت ہمیشہ میرے حال پر مبذول رہیگی۔ والسلام +

اس کے کچھ عرصہ بعد پھر میں نے ان کی خدمت میں لکھا:۔

سراج امت وہادیٔ طریقت!

رسالہ تہذیب الاخلاق بابت ماہ رمضان ۱۳۱۴ھ ہجری اب تک مجھے نہیں ملا۔ ع

نامہ ازوار الشفائے وصل دوست بہر رنجوراں ہجراں کاغذے

اس آخری پرچے میں کوئی ایسا مضمون درج کریں۔ جس سے دلوں پر چھریاں جائیں۔ فراق کے غم تازہ ہو جائیں۔ بے قرار پئے اشتیاق اور آتش فراق چمک اٹھے! دنیا کی سیر سے طبیعت سیر ہو جائے۔ اپنی بے ثباتی کی تصویر کھچ جائے۔ اور اس عالم کے فنا ہونے کا سما بندھ جائے! +

۱۴ فروری ۱۸۹۷ء کو جواب آیا کہ:۔ مخدومی و مکرمی۔ رمضان کا پرچہ تہذیب الاخلاق تو ضرور خریداروں کے پاس بھیجا جائیگا۔ مگر میں نے اس کو نہیں لکھا۔ بلکہ ایک دوست نے لکھا ہے۔ مجھ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ میرا دل اس کے لکھنے میں نہیں لگا۔ اور اسی واسطے میں نے خود نہیں لکھا +

مرتب ثانی نے اس کی ترتیب کو کسی قدر بدل دیا ہے۔ وہ یہ کہ پہلی ترتیب میں آرٹیکل تاریخ وار تھے اور مضامین کے لحاظ سے پریشان۔ اب قسموار ترتیب دیئے گئے ہیں۔ سوالات ایک جگہ کئے گئے ہیں۔ تعلیم کے متعلق مضامین ایک جگہ کئے گئے ہیں۔ ایک خط ایک آیت کی تفسیر کی تشریح میں اور دو سر الملکی سیاسی امور میں داخل کیا گیا ہے۔ جن کا تلف ہونا بہت ہی نقصان دہ ہوتا۔ سہولیت ناظرین کو مدنظر رکھکر بعض جگہ مناسب حاشیے دیئے گئے ہیں۔ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے قارئین خود ہی اندازہ لگا لینگے۔ طوالت ملال انگیز سے پرہیز کر کے ختم کلام کیا جاتا ہے۔ ناظرین ناچیز کو دعائے خیر سے یاد کریں اور سہو و فروگذاشت کو نظر عفو سے دیکھیں۔ احمد بابا مخدومی لاہوری ۲ دسمبر ۱۹۲۴ء

اگلے زمانہ میں علومِ دینیہ اور علومِ عربیہ و فلسفہ یونانیہ کی ترقی کس وجہ سے تھی اور اب کیوں تنزل ہو گیا ہے

ایک کلیہ قاعدہ ہے جو ہر ایک زمانہ اور ہر ایک قوم سے یکساں تعلق رکھتا ہے۔ اور کوئی چیز کسی زمانہ میں اس سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ قاعدہ یہ ہے۔ کہ جس چیز کی قدر ہوتی ہے۔ اُسی کی بہتات ہوتی ہے۔ جس کو انگریزی میں ڈمانڈ اور سپلائی کے لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے +

ڈمانڈ اور سپلائی پولیٹیکل اکونمی کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ مگر ہم نے ان کی جگہ قدر اور بہتات کے لفظ قائم کئے ہیں۔ تاکہ تمام اشیاء مادی وغیر مادی پر حاوی ہوں۔ کیونکہ درحقیقت یہ دو لفظ اشیاء مادی اور غیر مادی دونوں سے برابر تعلق رکھتے ہیں +

یہ بھی کلیہ قاعدہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ کیا جاتا ہے کسی نہ کسی غرض سے کیا جاتا ہے۔ اور وہ غرض کبھی تو اس کام کا معاوضہ حاصل کرنے کی ہوتی ہے۔ اور کبھی کسی امر میں کمال حاصل کرنے کی۔ جس کے باعث خود اس کے دل میں ایک قسم کا فخر پیدا ہوتا ہے۔ یا اعزاز و تقدس پیدا ہونے کی جس کی لوگ قدر کرتے ہیں۔ یا صرف دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے بغیر کسی ذاتی غرض کے یا بہ نیت خالص تقرب الی اللہ کے۔ پس ان تمام اسباب سے جس چیز کی قدر کی جاتی ہے اُسی کی بہتات ہوتی ہے +

مثلاً عرب جاہلیت میں شاعری کا بہت چرچا تھا ہر سال عکاظ کی منڈی میں شاعر جمع ہوتے تھے۔ اور اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ اور ہر ایک دوسرے پر سبقت لیجانا اور اپنا فخر اوروں پر جتلانا چاہتا تھا۔ جس سے اس کے دل میں بھی ایک قسم کا فخر پیدا ہوتا تھا۔ اور تمام قوم اس کو مفخر و معظم سمجھتی تھی۔ اور جزیرہ عرب میں اس کی ناموری ہوتی تھی۔ اور یہی غرض ان کو شاعری سے تھی۔ اور اسی کی قدر ملک میں بھی تھی۔ اس زمانہ میں شاعری کا بڑا اوج تھا۔ نہایت عمدہ شاعروں کے قصیدے خانہ کعبہ میں لٹکائے جاتے تھے۔ جن میں سے سات قصیدے اب تک مشہور و معروف ہیں۔ پھر اسلام کا زمانہ آیا۔ اور کذب کی برائی بتلائی۔ اور بتوں کی پرستش اور ان کی الٰہیہ تعریف کی جو ایک زیور بت پرستوں کی شاعری کا تھا ممانعت ہوئی۔ اور خدا نے فرمایا۔ "وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝" اس

سبب سے شاعری کی وہ قدر نہ رہی۔ جو زمانۂ جاہلیت میں تھی۔ اور شاعری کو تنزل ہو گیا۔ امام فخرالدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں نہایت عمدہ بات لکھی ہے۔ کہ اسلام کے بعد تمام شاعروں نے کذب چھوڑ دیا تھا۔ اور سچائی اختیار کی تھی۔ اس سبب سے ان کی شاعری اچھی نہ رہی تھی۔ اور اس میں تنزل ہو گیا تھا لبیدؓ اور حسانؓ جب وہ مسلمان ہو گئے۔ تو ان کے اشعار زمانۂ اسلام کی عمدگی اور خوبی میں ان کے ایام جاہلیت کے اشعار کے برابر نہ تھے۔ باایں ہمہ اسلام کے شروع زمانہ میں کچھ شعراء زمانۂ جاہلیت کے باقی تھے۔ اور ان لوگوں میں بھی جو زمانۂ قریب اسلام میں پیدا ہوئے تھے۔ جاہلیت کے زمانہ کے شعراء کا کچھ اثر تھا۔ جس کی مثال فرزدق میں پائی جاتی ہے۔ کہ جب ہشام ابن عبدالملک حج کو گیا۔ تو طواف میں کثرت ہجوم خلائق سے اس کو حجر اسود تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملتا تھا مگر جب ہمارے دادا حضرت امام زین العابدین علیہ السلام طواف کرتے کرتے وہاں پہنچے۔ تو تمام ہجوم کائی کی طرح پھٹ گیا۔ اور حضرت امام کو حجر اسود تک جانے کا راستہ دیدیا۔ ایک شخص نے جو شام کا رہنے والا تھا ہشام سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہیں؟ اس نے تجاہل عارفانہ سے کہا کہ میں نہیں جانتا۔ وہاں فرزدق شاعر بھی موجود تھا۔ ہشام کا یہ کہنا اس کو بہت برا معلوم ہوا۔ اس نے حضرت امام کی شان میں فی البدیہہ ایک قصیدہ کہا جس کے یہ چند اشعار ہیں ؎

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته — والبیت یعرفه والحل والحرم

هذا ابن خیر عباد الله کلهم — هذا التقی النقی الطاهر العلم

هذا ابن فاطمة ان کنت جاهله — بجده انبیاء الله قد ختموا

ما قال لا قط الا فی تشهده — لولا التشهد کانت لاءه نعم

یعنی یہ وہ شخص ہے کہ مکہ کی زمین اس کے نقش قدم کو پہچانتی ہے۔ اور خدا کا گھر اور اس کی بزرگ زمین اور تمام جنگل اور میدان اس کو جانتے ہیں۔ یہ فرزند ہے اُس کا جو تمام خدا کے بندوں میں سب سے بہتر تھا۔ یہ ہے بزرگ اور مقدس اور پاک جس کو سب جانتے ہیں یہ ہے فرزند فاطمہؓ کا گو کہ تو اس کو نہ جانتا ہو۔ اسی کے دادا پر خدا کے نبیوں کی نبوت ختم کی گئی ہے یہ ایسا فیاض ہے کہ بجز کلمہ پڑھنے کے کبھی اس نے "لا" کا لفظ نہیں کہا۔ اگر کلمہ میں بھی "لا" نہ ہوتا۔ تو "لا" کی جگہ وہ "نعم" ہی کہتا ؏

زمانہ خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس میں پھر شاعری کی قدر ہوئی۔ مگر شاعری کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ نہ اشعار میں عرب جاہلیت کا جوش تھا۔ نہ سادگی اور سلاست باقی رہی تھی۔ ہاں مضامین

۱-۲- عرب کے دو مشہور شاعر گزرے ہیں۔ حسان پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی نعت میں قصیدے کہا کرتے تھے۔ اور کفار کی ہجو کا جواب دیتے تھے ۱۲ (احمد بابا مخدومی)

وقیق اور نازک جو عرب جاہلیت کے خیال میں بھی نہ تھے۔ اور شاندار لفظ جو عرب جاہلیت کی سادگی کے مقابلہ میں ہیچ تھے۔ شعروں میں داخل ہو گئے تھے۔ مگر عرب جاہلیت کے اشعار تک کب پہنچ سکتے تھے۔ جیسے کہ فارسی میں ظہوری اور نظیری نے بہت کچھ لفاظی اور مضمون آرائی کی۔ مگر حافظ کی شاعری سے جو نہایت سادہ اور آمد کی خوبیوں سے مملو تھی۔ ان کے اشعار جن میں آورد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کب لگا کھا سکتے تھے ٭

بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ کے بعد شاعری کی اور بھی قدر گھٹتی گئی۔ اور اسی کے ساتھ اس میں تنزل آتا گیا۔ اور اب یہاں تک تنزل آگیا ہے کہ اگر میں چاہوں تو اپنے تئیں بھی عربی کا شاعر کہنے لگوں۔ گو کہ میں نے کبھی عربی کا شعر نہیں کہا۔ اور نہ کہہ سکتا ہوں۔ بلکہ عربی اشعار کو موزوں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اس سے بخوبی ثابت ہے کہ جس چیز کا ڈیمانڈ نہیں ہے۔ اس کی سپلائی بھی نہیں ہے۔ یعنی جس چیز کی قدر نہیں۔ اس کی بہتایت بھی نہیں ہے ٭

مگر یاد رہے کہ جو چیز دنیا میں بکار آمد اور فائدہ مند ہوتی ہے۔ اس کی قدر کبھی نہیں گھٹتی۔ جب تک کہ اس سے زیادہ مفید دوسری چیز پیدا یا ایجاد نہ ہو جائے۔ اور جو چیزیں بطور مشغلہ کے ہوتی ہیں۔ تو جب مشغلہ رکھنے والے نہیں رہتے۔ یا وہ ذریعہ باقی نہیں رہتا جو اس مشغلہ کو قائم رکھے۔ تو ان چیزوں کی قدر گھٹ جاتی ہے۔ شاعری اسی قسم کی چیز تھی۔ جس کی قدر زیادہ تر بطور مشغلہ کے کی جاتی تھی۔ جب وہ نہ رہا تو لازمی طور سے اس کا تنزل ہونا تھا۔ کیونکہ جب ڈیمانڈ نہ رہا تو سپلائی بھی نہ رہی ٭

نثر زمانہ جاہلیت کی ہم تک نہیں پہنچی۔ اور جو ٹکڑے نثر جاہلیت کے بعض کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان پر پورا یقین نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ خالص جاہلیت کے ہیں۔ اسلام کے قرن اوّل کا کلام یا خطبات جس قدر ہم کو ملتے ہیں۔ وہ بھی بذریعہ روایات کے ہم تک پہنچے ہیں۔ ان پر بھی پورا یقین نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ خالص کلام قرن اوّل اسلام کا ہے۔ صرف قرآن مجید ہمارے پاس یقین کے قابل ہے۔ جو ابتدائے اسلام اور آخر عہد جاہلیت کا کلام یقیناً خیال میں آ سکتا ہے ٭

قرآن مجید کو ہم وحی متلو یا خدا کا کلام یقین کرتے ہیں۔ مگر جب وہ انسانوں کی زبان میں نہایت فصیح و بلیغ طرز پر وحی ہوا ہے۔ تو اس لئے ہم اس کو اس زمانہ کے لٹریچر سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر وہ کلام ایسا بے نظیر اور بے مثل ہے کہ آج تک نہ کسی سے ویسا ہوا ہے۔ اور ہم یقین کرتے ہیں۔ کہ نہ مثل اس کے آیندہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب ہم نے دیکھا ہے کہ عربی لٹریچر کا روز بروز زوال ہوتا گیا ہے تو یہ پیشین گوئی کرنی کہ آیندہ بھی مثل قرآن کے کوئی تحریر نہیں ہو سکنے کی۔ کوئی ناقابل

یقین بات نہیں ہے۔ ان تمام وجوہات سے ہم زمانۂ جاہلیت کی نثر سے اسلام کے بعد کی نثر میں جو تنزل ہوا ہے اس کو علانیہ نہیں دکھا سکتے۔ مگر جب کہ فصحائے عرب مثل قرآن کے کوئی تحریر نہ لا سکے تو اس پر یقین ہو سکتا ہے۔ کہ اس زمانہ کے فصحا بھی قرآن کی مثل تحریر کرنے پر عاجز تھے۔

سخت افسوس اُن لوگوں پر ہے جو یہ سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں۔ کہ قرآن مجید کی عبارت بھی یکساں نہیں ہے۔ بلکہ بعض آیتیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور بعض مقامات ویسے اعلیٰ درجہ کے نہیں ہیں مگر ایسا کہنا یا سمجھنا ان لوگوں کی نہایت ناسمجھی ہے۔ ادائے کلام بمقتضائے اُس مضمون کے ہوتا ہے جو ادا کیا جاتا ہے۔ نعیم جنت اور وعید جحیم ایک طرز کلام سے ادا نہیں ہو سکتیں اور نہ ان کو ایک طرز پر ادا کرنا مقتضائے فصاحت و بلاغت ہے۔ جس وقت کہ ایک مضمون قہر آلو واسطے زجر و توبیخ لوگوں کے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب دوسری طرح کی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کو پڑھتے ہیں۔ تو اس وقت صرف وہ لفظ ہی موجود ہوتے ہیں۔ اور جس ٹون[1] سے وہ لفظ ادا کئے گئے ہیں۔ وہ ٹون موجود نہیں ہوتی۔ مگر اس کے الفاظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب اس قسم کی ہوتی ہے۔ کہ پڑھنے والے کے دل میں وہی ٹون پیدا کر دیتی ہے۔ اور جب کوئی مضمون محبت اور شفقت اور رحم اور عفو کا بیان ہوتا ہے۔ تو اس کے لفظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب جدا قسم کی ہوتی ہے (اور جب کوئی واقعہ یا حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ تو اس کے الفاظ نہایت سادہ اور عبارت سلیس اور سہل ممتنع ہوتی ہے) قرآن مجید میں یہ تینوں قسم کے مضامین اور ان کے مناسب الفاظ اور ان کے مطابق طرز بیان سب موجود ہے۔ اور ہر قسم کا مضمون جس طرح پر بیان ہوا ہے وہ بے مثل اور بے نظیر عبارت میں بیان ہوا ہے۔ پس یہ کہنا کہ۔ کُرسد "تبت یدا" با "قیل یا ارض ابلعی" نہایت بے سمجھی اور محض سفاہت کی بات ہے۔

بنی اُمیّہ اور بنی عباس کے زمانہ میں جو نثریں لکھی گئیں اور جن پر ان کے لکھنے والوں کو مثل مقامات حریری وغیرہ کے فخر ہے۔ وہ قرآن مجید کے سامنے نہایت ہی متبذل اور نہایت ہی حقیر ہیں۔ اور ہر شخص یقین کر سکتا ہے۔ کہ جو سادگی اور سلاست عرب جاہلیت سے منسوب ہے وہ مطلق اس کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اور نہ عرب جاہلیت کے خیالات اس قسم کے تھے۔ جو اُن میں ادا کئے گئے ہیں۔

سب سے زیادہ مقدّس حدیث کا علم ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے وقت میں تو حدیث کی روایت کرنے کی ممانعت تھی۔ خود حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حدیث کی روایت کرنے سے منع کر دیا تھا۔ جو لوگ حدیث کی روایت کرتے تھے۔ اُن کی دُرّہ سے خبر لیتے تھے۔

[1] آواز۔ لہجہ معلوم ۱۲ (احمد بابا مخدومی)

اور ابن مسعود - ابو درداء اور ابو مسعود انصاری کو بجرم روایت احادیث قید کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خود حضرت ابو بکرؓ نے جس قدر حدیثیں جمع کی تھیں وہ جلادی تھیں +

اگرچہ یہ نہیں معلوم ہوتا۔ کہ کثرت سے حدیثوں کی روایت کرنے کا سلسلہ کب سے شروع ہوا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد شروع ہوا ہو گا۔ خود صحابہ رضی اللہ عنہم نے حدیث کی روایت شروع کر دی تھی۔ اور ہم یقین کرتے ہیں۔ کہ صحابہ صرف خالصاً لوجہ اللہ احادیث کی روایت کرتے تھے +

اُس زمانہ میں حدیث کی روایت ایک سے دوسرے کو صرف زبانی تھی۔ مگر جو صحابہ زیادہ حدیثیں بیان کرتے تھے وہ مُعزّز اور مقدّس اور بہت بڑے حدیث جاننے والے خیال کئے جاتے تھے۔ اور تمام صحابہ ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ صحابہ کے بعد جو راوی تھے اُن کا بھی اعزاز کچھ کم نہ تھا۔ اور جو شخص کوئی حدیث روایت کرتا تھا وہ زیادہ مکرّم اور مقدّس سمجھا جاتا تھا۔ اسی تقدّس حاصل کرنے کو بہت سے لوگ جھوٹی حدیثوں کی روایت کرنے پر مائل ہوئے۔ اور حدیث کی روایتیں کرنے لگے۔ اور عن فلانٍ عن فلانٍ۔ یا اخبرنا فلانٌ۔ یا انبأنا فلانٌ کہکر اخیر کو قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہدیتے تھے۔ چنانچہ علمائے حدیث کو جو آخر کو ہوئے۔ احادیث موضوع کے چھانٹنے میں نہایت مشکلات پیش آئیں۔ اور اس کے پرکھنے اور جانچنے کے لئے متعدد قاعدے بنائے +

یہ گرماگرمی اور زبانی روایت کرنے والوں کا اعزاز و تقدّس اس وقت تک باقی رہا۔ جب کہ زبانی روایت کی کچھ ضرورت باقی نہ رہی۔ اور وہ زمانہ وہ تھا۔ جب علماء محدثین رضی اللہ عنہم اجمعین نے بعد تحقیق و تفحص راویوں کے حال کی حدیث کی کتابیں لکھنی شروع کیں۔ جب حضرت امام مالکؒ نے اپنی مُوطّا لکھ لی۔ تو جو حدیثیں اس میں لکھی گئی تھیں ان حدیثوں کی نسبت کسی راوی کی زبانی روایت کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی +

اس طرح جب محمد اسماعیل بخاری نے اپنی کتاب لکھ لی تو ان حدیثوں کی نسبت بھی کسی راوی کے زبانی روایت کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ رفتہ رفتہ صحاح ستّہ بلکہ صحاح سبعہ مرتّب ہو گئیں۔ تو زبانی روایت کرنے والوں کی کچھ قدر نہیں رہی۔ یعنی ان کا ڈمانڈ نہیں رہا۔ اور زبانی روایت بالکل زوال پذیر ہو گئی +

اب تمام دارومدار علم حدیث کا ان کتابوں پر رہ گیا۔ جو صحاح کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر اس وقت بھی راویوں کے حالات بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ اور ان کے حالات کا بیان کرنا صرف زبانی بیان پر منحصر تھا۔ یہاں تک کہ اسماءِ رجال کی کتابیں مرتّب ہو گئیں۔ اور اس وقت راویوں کے حال کی جو روایت زبانی بیان کی جاتی تھی اس کا ڈمانڈ بھی نہ رہا۔ اور اُس

کو بھی زوال ہو گیا۔

اب علم حدیث کا اور محدث ہونے کا دارومدار صرف ان کتابوں کے پڑھنے اور جاننے پر رہ گیا۔ جو علم حدیث میں لکھی گئی تھیں۔ ابتدا ابتدا میں تو اُسی شخص کی عزت کی جاتی تھی۔ جس نے وہ کتابیں ایسے شخص سے پڑھی ہوں جس نے اپنی قرأت یا سماع کا سلسلہ ان کتابوں کے مصنف تک پہنچا دیا ہو۔ مگر بعد کو یہ قید نہیں رہی۔ بلکہ چند جزو حدیث کی کتاب پڑھ لینے کے بعد اُستاد کل کتاب کی سند دیدیتا ہے۔ مگر ہر زمانہ میں محدثین نہایت مقدس اور معزز گنے جاتے تھے۔ اور تمام مسلمان کیا امیر کیا فقیر کیا بادشاہ۔ محدثین کا نہایت اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ اور جو اوصاف اُن میں تھے۔ درحقیقت وہ اسی قابل تھے۔ کہ لوگ ان کا اعزاز و اکرام کریں۔ اور ان کو مقدس جانیں۔ رفتہ رفتہ محدثین کے اوصاف میں بھی کمی ہوتی گئی۔ اسی کے ساتھ اُن کے اعزاز اور تقدس میں کمی ہوئی۔ اور اسی کے ساتھ علم حدیث کا بھی تنزل شروع ہوا۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ کہ علمائے علم حدیث اس تقدس و اعزاز و اکرام حاصل کرنے کے ارادہ سے حدیث کے سیکھنے میں مشغول رہتے تھے۔ غالباً ان کی نیت خالصاً للہ ہو گی۔ مگر اس میں بھی کچھ شبہ نہیں۔ کہ اس سبب سے ان کو فتوحات سلاطین کی طرف سے اور عام لوگوں کی طرف سے اس قدر پہنچتی تھیں۔ جو ان کی حاجت اور ضرورت سے بہت زیادہ تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ اس میں بھی زوال آ گیا۔ اور اسی کے ساتھ علم حدیث کو بھی زوال ہو گیا۔

اس زمانہ میں حدیث کی کتابوں کی شرحیں ایسی مفصل لکھی ہوئی موجود ہیں۔ جن میں ہر ایک امر کی نسبت پوری بحث ہے۔ اور اسماء رجال کی متعدد کتابیں نہایت مبسوط موجود ہیں۔ اس لئے کسی شخص کو جو عربی جانتا ہے کسی اُستاد سے حدیث پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ جو کچھ وہ ان کتابوں میں دیکھ کر پاتا ہے۔ اُستاد کبھی اتنا یا اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔ اور یہی وجہ ہوئی ہے۔ کہ حدیث کی پوری کتابیں پڑھنے کی اب رسم نہیں رہی۔ بلکہ صرف تبرکاً کوئی حدیث کی کتاب کسی اُستاد سے شروع کی جاتی ہے۔ اور چند جزو پڑھنے کے بعد اُستاد اس کتاب کی سند دیدیتا ہے۔ شاذونادر ہی طالب علم ہونگے۔ جو اُستاد سے حدیث کی پوری کتاب پڑھتے ہونگے۔

حدیث کے بعد مقدس علم فقہ کا ہے۔ ائمہ مجتہدین کے زمانہ سے پہلے ہر ایک شخص حدیث پر جو اُس کو پہنچی تھی۔ یا تعامل پر عمل کرتا تھا۔ اس زمانہ کے بعد ان حدیثوں پر جو کتابوں میں لکھی گئی تھیں۔ اور جو مطلب ان کا وہ سمجھتا تھا یا جس کو عالم اور مقدس سمجھتا تھا۔ اس کی سمجھ پر عمل کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ فقہ اور اصول فقہ کی کتابیں مرتب ہوئیں۔ اور اہل سنت وجماعت

میں چار امام مقبول ہوئے۔ اور جو امام جس شہر یا نواح شہر میں تھا وہاں کے لوگ جو اس کے شاگرد تھے اس کی رائے پر چلتے تھے۔ رفتہ رفتہ تقلید کا دور ہوا۔ اہل علم نے قرآن و حدیث پر غور کرنا اور اس سے مسائل کا استخراج کرنا چھوڑ دیا۔ اور جو کچھ ائمہ مجتہدین نے کہا اسی پر اکتفا کیا۔ اس سبب سے ان لوگوں میں سے مادۂ اجتہاد کا زوال ہو گیا +

ابتدا ابتدا میں ایسے لوگ بھی تھے جو مرجحین فی الرّوایت کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ فلاں حکم کہاں سے استنباط کیا گیا ہے۔ اور کتاب و سنت سے اس کی کیا دلیل ہے۔ اور جس کو قوی سمجھتے تھے اس کو اختیار کرتے تھے۔ مگر جب فقہ کی کتابیں زیادہ مبسوط تصنیف ہو گئیں جن میں ہر ایک امر کی تفصیل تھی۔ تو مرجّحین فی الروایت کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اور اس میں بھی زوال آگیا۔ اب صرف روایات جزئیہ پر جو کتب فقہ اور فتاووں میں مندرج ہیں۔ دار و مدار قضا اور افتا کا رہ گیا ہے۔ ان قاضیوں اور مفتیوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ حکم کہاں سے اور کیونکر اور کس وجہ سے استنباط ہوا ہے۔ بڑا فقیہ وہ ہے جو ہر ایک جزئی روایت کو کسی فتاوے سے نکال دے +

اس زمانہ میں ایک فرقہ ہے۔ جو اپنے تئیں اہل حدیث کہتا ہے۔ اور اس کے مخالف اس کو وہابی کہتے ہیں۔ وہ فرقہ تقلید کا منکر اور عمل بالحدیث کا قائل ہے۔ مگر وہ بھی تقلید میں پھنسا ہوا ہے اس لئے کہ اس نے احادیث مجتمعہ میں درایت کو چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ اس کو حرام سمجھتا ہے۔ اور حدیثوں کی نسبت اگلے لوگ جو لکھ گئے ہیں۔ اس کی تقلید کرتا ہے۔ اور جس قدر لوگوں کی مقلدین ائمۂ مجتہدین تقلید کرتے ہیں۔ اس سے بہت زیادہ لوگوں اور راویوں کی یہ فرقہ تقلید کرتا ہے۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ جس چیز کا ڈیمانڈ تھا۔ اسی کی سپلائی تھی۔ جب ڈیمانڈ نہ رہا تو سپلائی بھی نہ رہی +

اس کے بعد فلسفہ ہے۔ جس کے جاننے پر چند علمائے اسلام بہت فخر و ناز کرتے تھے مگر بعض علماء اسلام نے تو اس کا پڑھنا حرام بتلایا ہے۔ اور بعض نے منطق کو بھی جزو فلسفہ سمجھ کر اس کے پڑھنے کو بھی حرام ٹھیرایا ہے +

یہ فلسفہ جو اب تک ہمارے پاس ہے دراصل یونانیوں سے جو بُت پرست تھے۔ لیا گیا ہے۔ اس کا موضوع زیادہ تر انجانی چیزوں پر بحث کرنی ہے۔ اور بہت سا حصّہ اس کا خیالی امور پر بحث کرنے سے متعلق ہے۔ اس لئے یہ بھی بطور ایک مشغلہ کے سمجھے جانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ اس سے کوئی امر محقق حاصل نہیں ہوتا۔ ہیولٰے[1] اور صورت اور جزو لایتجزیٰ کی بحث میں عمر صرف ہو جاتی ہے +

[1] ہیولا۔ ہر چیز کا مادّہ۔ ہر شے کی ماہیت۔ ہر چیز کی اصل۔ حکما نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔ کہ جسمانی صورت کا محل ہے۔ جوہر اوّل کو بھی کہتے ہیں۔ بعض اس کو ہئیت اولٰے کا مخفف کہتے ہیں + (باقی نوٹ صفحہ ۱۸ پر)

اِس فلسفہ کے مقابلہ کے لئے علماءِ اسلام نے علم کلام ایجاد کیا تھا۔ تاکہ اسلام کو اس کے صدمہ سے بچاویں۔ اس لئے چند مسائل فلسفہ کے علم کلام میں داخل ہو گئے تھے مگر بہت ہی کم۔ اور شاید کوئی بھی نہیں۔ علمائے مذہب ایسے ہوئے ہیں جن کو اس فلسفہ میں کافی دستگاہ حاصل ہوئی ہو۔ اور اس لئے ضرور تھا کہ اس فلسفہ کو روز بروز تنزّل ہوتا جاوے۔ کیونکہ اس کا ڈمانڈ نہیں تھا۔ یا بُہت ہی کم تھا +

علم ادب کا عروج یا تو سلاطین کی قدر کے سبب سے تھا یا اس سبب سے تھا۔ کہ اسی زبان کے ذریعہ سے مذہبی کتابیں پڑھی جاتی تھیں۔ ایسے لوگ تو بُہت کم گذرے ہیں جنہوں نے عربی زبان کو علوم عربیہ اور علوم مذہبیّہ کو صرف خالصاً للہ پڑھا ہو۔ بلکہ وہ علم جو ذریعہ حصُول معاش کے بھی تھے۔ اور عہدۂ قضا اور اِفتا اور تولیت اور محتسب اور دبیر و وزیر اور دیگر عہدہ ہائے دفاتر سلطنت سلطنت ہائے اسلامیہ ان کے پڑھنے سے حاصل ہوتے تھے۔ اور نیز اعزاز و تقدس اور قبولیت عام انہی علوم کے پڑھنے سے ہوتی تھی۔ اور نیز فتوح سلاطین اور نذر و نیاز عوام انہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی تھی۔ اس لئے کثرت سے لوگ ان علوم کے پڑھنے پر متوجہ تھے۔ جب کہ ان کا ڈمانڈ نہ رہا۔ تو ان کی بہتایت بھی نہ رہی تعجب ہے کہ اگلے زمانہ میں فقراء اور صوفی اور صاحبان سجّادہ و خانقاہ بہت کثرت سے موجود تھے۔ مگر اس زمانہ میں وہ بھی نایاب ہیں۔ اور اگر کہیں کچُھ اس کے مُدّعی پائے جاتے ہیں۔ وہ اگلے لوگوں کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہیں۔ اس کا سبب کچھ ہی ہو۔ مگر یہ کُلیہ کہ جس قدر ڈمانڈ ہوتا ہے۔ اسی قدر سپلائی بھی ہوتی ہے۔ ان پر بھی صادق آتا ہے +

اگلے زمانہ میں بہت بڑی مشکل یہ تھی کہ اگر کوئی عالم کسی مسئلہ میں کوئی بات جو مذاہب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۷) جزو لایتجزّٰی۔ ایسی چیز جو نہایت چھٹائی اور باریکی کی وجہ سے اس قابل نہ ہو۔ کہ اس کو بانٹا جا سکے۔ اگلے یونانی حکما اس کی تقسیم کے قائل تھے۔ اور کئی توجیہوں سے اس کو ثابت کرتے تھے۔ لیکن اسلامی حکما جن کو متکلمین کہا جاتا ہے۔ اس کی تقسیم کے قائل نہ تھے +

متکلمین کہا کرتے تھے۔ کہ اگر ہر جسم انقسامات غیر متناہیہ کے قابل ہے۔ تو لازم آتا ہے کہ خردل (رائی) کے ایک دانے کی جزوں سے اگر انہیں کرۂ ارض واحداً بعد واحد مبسوط کیا جائے۔ تو ساری زمین ڈھانکی جائے۔ اس لئے کہ خردل کے اجزاء جیسا کہ حکماء کا مذہب ہے۔ غیر متناہی ہیں۔ اور پھر ظاہر ہے کہ زمین کا محیط متناہی ہے۔ اور غیر متناہی متناہی کو ڈھانک سکتا ہے۔ بلکہ بچ بھی رہتا ہے +

صورت۔ ایک جوہر ہے کہ جب جسم مطلق سے لاحق ہوتا ہے۔ اسے دیگر انواع سے جداگانہ کر دیتا ہے۔ صورت نوعی۔ صورت ترکیبی اسی کی ذیل میں ہیں مذکورہ سہ الفاظ کا مفہوم بہت ہی سیدھے اور صاف لفظوں میں بتا دیا گیا ہے۔ کہ پڑھنے والا موٹے طور پر ان علمی اصطلاحوں سے آگاہی حاصل کر لے + (احمد محمدی)

مروجہ کے خلاف بھی تحقیق کرتا تھا۔ تو اس کو ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ اور اگر ظاہر ہو جاتی تھی۔ تو قتل وقید سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اس لئے تحقیقات مسائل مذہبی بالکل بند ہوگئی تھی۔ امام غزالی نے اس میں کسی قدر جرأت کی اور چھوٹے چھوٹے رسالے "المظنون علی غیر اهله" اور "المظنون علی اهله" اور "التفرقه بین الاسلام والزندقه" لکھے۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ ملکشاہ سلجوقی کے چنگل سے بچ گئے۔ ورنہ قتل ہونے میں کچھ باقی نہ تھا۔ ان کی کتاب "احیاء العلوم" جو نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس میں بھی کچھ شائبہ تحقیق جدید کا پایا جاتا ہے۔ اس کے بھی جلانے اور معدوم کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہمارے قریب زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ہوئے جو محدث بھی کہلاتے تھے۔ مگر ان کے خیالات واقوال بھی کسی قدر تحقیقات جدید پر مائل تھے۔ اُن کی قدر بھی نہ اُس زمانہ میں ہوئی جب وہ زندہ تھے۔ اور نہ اِس زمانہ میں لوگوں کے دلوں میں اُن کی قدر ہے۔ باوجودیکہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ اِس اخیر زمانہ میں مثل اُن کے کوئی دوسرا عالم نہیں ہوا +

اِس زمانہ میں ہر ایک کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ مگر اب نہ پہلے سے عالم ہیں۔ اور جو ہیں کیا مقلد اور کیا اہل حدیث سب تقلید کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور ان میں مادۂ اجتہاد و تحقیق معدوم ہو گیا ہے۔ پس ہر ایک اپنی لکیر پر فقیر ہے۔ اور کولھو کے بیل کی مانند اُسی حلقہ میں چکر کھاتا جاتا ہے جس حلقہ میں اس کو آنکھ بند کرکے ہانکا تھا

اس زمانہ میں ایک مقدس گروہ علوم عربیہ کے زندہ کرنے اور رونق دینے پر آمادہ ہے۔ ہم بھی خدا سے چاہتے ہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ بموجب اس قاعدۂ کلیّہ کے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ بغیر ڈمانڈ کے سپلائی نہیں ہو سکتی

اگلے زمانہ میں جو علوم عربیہ کو رونق تھی وہ سلاطین کے انعامات۔ جاگیرات۔ اُمراء کے صِلات۔ اور عوام کی نذرات حصول معاش کے ذرائع اور تقدس حاصل ہونے کے سبب سے تھی۔ اور یہی امور اُن کے لئے ڈمانڈ تھے۔ مگر اب یہ ڈمانڈ نہیں رہا۔ اُس کی سپلائی کیونکر ہو سکتی ہے۔ باقی رہا خالصاً للہ۔ اور بہ نیّت ثواب بلا خیال تقدس کسی علم کو یا علم دین کو حاصل کرنا۔ یہ تو شاید کسی کا مقصد ہو۔ کیونکہ نیک آدمیوں سے دنیا خالی نہیں ہے۔ مگر کروڑوں مسلمانوں کا جو دنیا بستے ہیں یہی ایک مقصد نہیں ہو سکتا۔ وللہِ دُرُّ من قال ؎

شب کہ عقد نماز بر بندم چہ خورد بامداد فرزندم

ہاں یہ بات دوسری ہے کہ کوئی نماز پڑھ کر یا پڑھا کر پیٹ بھرے۔ کوئی وعظ کہکر پیٹ پالے۔ کوئی حدیث۔ فقہ پڑھا کر معاش حاصل کرے۔ کوئی فقیر اور مشائخ اور سجادہ

نشین ہو کر زندگی بسر کرے +

اس زمانہ میں مدارس علوم عربیہ اس کثرت سے ہیں۔ کہ پہلے زمانہ میں نہ تھے۔ مگر چونکہ اُن کا ڈمانڈ نہیں ہے۔ سب کے سب خستہ حالت میں ہیں۔ اور لوگوں کو برباد کرتے جاتے ہیں اور آخر کو خود بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ قلیل مسلمانوں کا ہے۔ جو علوم زبان انگریزی کی تحصیل میں مشغول ہے۔ ان پر بے انتہا جھوٹی جھوٹی تہمتیں لگائی جاتی ہیں۔ اور ان جھوٹی تہمتوں کا لگانا بڑی دینداری سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ اِدھر اُدھر دونو طرف ملے جُلے ہیں ان سے اُن کے قدیم یار کہتے ہیں۔ "اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ" تو وہ جواب دیتے ہیں۔ "اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ" اور خدا کہتا ہے۔ "اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ" اس پر ہمارے انگریزی خوان طالب علم کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں جس چیز کا پہلے زمانہ میں ڈمانڈ تھا۔ اُس کو پہلے لوگ حاصل کرتے تھے جس چیز کا اس زمانہ میں ڈمانڈ ہے۔ اس کو ہم حاصل کرتے ہیں۔ پس ہم میں اور پہلوں میں کچھ فرق نہیں ہے +

ان انگریزی خواں لوگوں میں جو لوگ کچھ زیادہ جان گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان علوم کو جو عربی میں ہیں کیوں پڑھیں۔ جب کہ تمام علوم جو اُس میں تھے۔ بہت زیادہ اور اعلےٰ درجے پر ترقی کر گئے ہیں۔ اور اُس میں بہت سے علم ایسے ہیں۔ جو محض غلط اور خیال خام پر مبنی تھے۔ اور جن کی غلطیاں علانیہ ظاہر ہو گئی ہیں۔ اور بہت سے علوم جدید تحقیق ہو گئے ہیں پس اگر ہم علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو ترقی یافتہ علوم قدیم اور تحقیقات شدہ علوم جدید کو کیوں نہ حاصل کریں +

بعض علما ان کو نصیحت کرتے ہیں۔ کہ ارے کم بختو علوم دین کو تو پڑھو۔ تو وہ ان عالموں کو جواب دیتے ہیں کہ علوم دین سے اگر تمہارے نزدیک ہماری کنارہ کشی ہے۔ تو اُس کا عذاب اور گناہ تمہارے سر پر ہے۔ کیونکہ کتب قدیمۂ مذہبی میں تم سے بزرگوں نے ایسے امور شامل کر دیئے ہیں۔ جن کا غلط ہونا ثابت ہو گیا ہے۔ خدا اور رسول نے اُن کو شامل نہیں کیا۔ بلکہ علمانے اپنی غلطی سے اُن کو مذہب میں شامل کر دیا ہے۔ اور تم ان کی تنقیح نہیں کرتے۔ علاوہ اس کے علوم جدیدہ سے جو بعض مشکلات امور مذہبی میں پیش آتی ہیں۔ اُن کو تم حل نہیں کرتے۔ اور علوم جدیدہ کے مقابلے کے لئے کوئی جدید علم کلام نہیں بناتے۔ جیسا کہ تمہارے پیشواؤں نے یونانی فلسفہ کے لئے بنایا تھا پس جو کچھ اس میں گناہ ہے۔ وہ تمہارے سر پر ہے۔ مگر برائے خدا ایسا علم کلام نہ بنانا کہ الٹی ہنسی ہو +

بہت سے بزرگ انگریزی خوان لوگوں کو بدعقیدہ یا ملحد و دہریہ کہتے ہیں۔ شاید ایسا کوئی ہو جس سے میں واقف نہیں ہوں۔ مگر ایسے لوگوں سے واقف ہوں۔ جو ایک حرف انگریزی کا نہیں جانتے وہ کیسے بدعقیدہ ہیں۔ اور اگر میں مذہب اسلام کا ایک وسیع دائرہ

میں ہونا تسلیم نہ کرتا۔ تو ان کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر دینا +

انگریزی خوانوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نیچری خیال رکھتے ہیں۔ اور نماز روزہ کے پابند اور احکام مذہبی میں چست نہیں ہیں۔ اور عقائد مذہبی سے ناواقف محض ہیں۔ یہ کہنا کسی قدر صحیح ہے۔ مگر انگریزی مدرسوں اور مشنریوں کے مدرسوں کی نسبت یہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ یورپ کے مدرسوں میں علاوہ پروفیسروں کے ایک شخص طالب علموں کے مذہب کی نگہبانی کے لئے مقرر ہوتا ہے۔ جو ڈین کہلاتا ہے۔ ہم نے بھی اپنے کالج میں طالب علموں کی مذہبی حفاظت کے لئے ایک نہایت لائق عالم مقرر کیا ہے۔ جس کی نصیحت سے طالب علموں کو بہت فایدہ ہے۔ تمام طالب علم جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں مختصر کتابیں عقائد مذہبی کی اُن کو پڑھائی جاتی ہیں۔ اسلام کی مختصر تاریخ اُن کے درس میں شامل ہے جنھوں نے عربی زبان بطور سیکنڈ لنگویج کے لی ہے اُن کو عربی میں۔ اور جنھوں نے سیکنڈ لنگویج لی ہے اُن کو فارسی میں۔ اور چھوٹے لڑکوں کو نماز کی کتابیں اُردو میں پڑھائی جاتی ہیں پس ہمارے کالج کی نسبت یہ کہنا کہ انگریزی خوان طالب علموں کو عقائد مذہبی سے لاعلمی ہوتی ہے۔ محض غلط ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں۔ کہ ہمارے کالج کے طالب علم جس قدر نماز روزہ کے پابند ہیں شاید بہت کم گھرانے ایسے نکلینگے جن کے لڑکے اُس قدر نماز روزہ کے پابند ہوں +

احکام مذہبی میں چست نہ ہونے کی نسبت ہم پوچھتے ہیں۔ کہ کونسا خاندان ہے جس کے لڑکے انگریزی نہیں پڑھتے اور وہ احکام مذہبی میں چست ہیں۔ یا زمانہ سابق میں کوئی خاندان تھا جس کے لڑکے احکام مذہبی میں چست تھے۔ لڑکوں کو جانے دو ہم بڑھوں کی نسبت پوچھتے ہیں کہ سوا اشخاص خاص کے کس قدر ہیں جو احکام مذہبی میں چست ہیں۔ جس طرح زمانہ کے مسلمانوں کا حال ہے ہماری دانست میں ہمارے کالج کے طالب علموں کا اس سے بہتر حال ہے۔ کہنے والوں کو اختیار ہے جو چاہیں سو کہیں +

بعض علما مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں۔ کہ نئی روشنی والوں یعنی انگریزی خوانوں اور اُن کے حامیوں کو آگے بڑھتے جانے دو۔ اگر تم دینی تمدنی ترقی چاہتے ہو۔ تو پیچھے ہٹو۔ اور پچھلے لوگوں سے ملو۔ اور یہاں تک پیچھے ہٹو کہ ہٹتے ہٹتے صحابہ اور نبی آخر الزمان سے جا ملو۔ اے حضرت پیچھے ہٹنا تو آسان ہے مگر صحابہ اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم تک جا ملنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ مجھ کو خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے گڑھے میں جا پڑو۔ "لا تکم علیٰ شفا حفرۃ" پھر ہم علی جزی سے کہتے ہیں کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانہ تک پہنچنا تو دشوار ہے۔ مگر برائے خدا پیچھے ہٹنے کی نصیحت نہ فرمایئے جس جگہ کہ مسلمان تھے اُسی جگہ ٹھیرے رہنے تو مسلمانوں کو اور مسلمانی

سلطنتوں کو برباد۔ قوم اسلام کو ذلیل اور خوار کر دیا۔ دنیا میں جہاں مسلمان ہیں۔ سب ایک حالت میں ہیں۔ پھر اب ان کو پیچھے ہٹا کر کیا کیجئے گا۔ کیا ان کو معدوم کر دینے کا ارادہ ہے۔ خدا نہ کرے بقول ایک بزرگ کے مسلمان عالموں نے اپنے تعصب بے جا یا نادانی اور بے سمجھی اور جھوٹی دینداری اور جھوٹی ترک دنیا کی نصیحت کرتے کرتے تو مسلمانوں کو لنگوٹی بندھوا دی۔ اب کیا آپ کا ارادہ اِس لنگوٹی کے بھی کھلوا لینے کا ہے +

اب ہم مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں۔ اور بلا خوف لومۃ لائم۔ بلند آواز سے کہتے ہیں۔ کہ مذہب اسلام کی شان نہایت ارفع ہے۔ اور دنیوی جاہ و مکنت۔ دولت و عزت کے حاصل کرنے سے اور اس میں ترقی کرنے سے اس میں کوئی خلل نہیں آتا۔ اسلام کی عزت۔ اسلام کی شان و شوکت خود مسلمانوں کی عزت اور مسلمانوں کی شان و شوکت سے ہے۔ وہ علیحدہ بُت نہیں ہے جس کی پرستش مسلمانوں سے علیحدہ ایک مندر میں یا کعبہ کی چار دیواری میں کی جائے۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی کرو۔ اور دیکھو کہ جب کبھی مسلمانوں نے علوم مذہبی کے ساتھ علوم دنیاوی میں ترقی کی اور دنیا میں دولت اور عزت شان و سوکت حاصل کی۔ وہی زمانہ اسلام کی ترقی اور جاہ و جلال اور عزت و شوکت کا سمجھا جاتا ہے۔ جو علماء (اور وہ غالباً حنفی علماء ہیں) نصیحت کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علوم جدیدہ میں ترقی کرنے سے مسلمانوں کے ایمان میں خلل آتا ہے۔ اُن کو یاد رکھنا چاہئے اور نہیں بھولنا چاہئے کہ "الایمان لا یزید ولا ینقص"۔ اور اُن کو سوچنا چاہئے۔ اور نہایت راستبازی سے کہنا چاہئے (کہ اسلام میں اور دنیوی عزت حاصل کرنے میں کوئی تناقض نہیں ہے) اور اب بجائے اس کے کہ وہ پکارتے ہیں کہ زمانہ کے رُخ کے برخلاف حرکت کرو مسلمانوں کو یہ سچی نصیحت کرنی چاہئے کہ "دُز مع الدھر کیف ما دار"۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم اور گورنمنٹ

ایک زمانہ ہندوستان پر ایسا گذرا ہے کہ بڑے بڑے پولیٹشنوں کی یہ رائے تھی کہ ہندوستانیوں کو علوم جدیدہ اور زبان انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دینا نہیں چاہئے۔ بلکہ اُن کو ایشیائی علوم میں جو محض بے سود ہیں غلطاں اور پیچاں رہنے دینا مناسب ہے۔ تاکہ ہندوستان کو زیر رکھنے اور ہندوستان کو وحشیوں کی حالت سے آگے نہ بڑھنے اور اُن کی آنکھ کے نہ کھلنے دینے کو اس سے بہتر کوئی پالیسی نہیں ہے +

اُن کے برخلاف چند نیک دل پالیٹشن ایسے تھے جن کی یہ رائے تھی کہ نہیں ہندوستانیوں کو اعلےٰ تعلیم دینا چاہئے اگر ہم ایسا نہ کرینگے۔ تو اپنا فرض اُن لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے ہم کو حکومت دی ہے ادا نہیں کرینگے +

چند سال تک پہلوں کی رائے غالب رہی اور ایشیائی علوم اور ایشیائی زبانوں کی تعلیم پر بڑی سرگرمی رہی۔ آخر کار پچھلوں کی رائے غالب آئی جس کا نتیجہ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کا قائم ہونا ہے۔ مگر یہ مت سمجھو کہ پہلی رائے معدوم ہوگئی ہے۔ بلکہ اب تک موجود ہے اور اُس کے پھر زندہ ہونے کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ وہ پھر زندہ ہوجائے یا زندہ ہوگئی ہو +

ہندوستان کی یونیورسٹیاں مثل انگلستان کی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اس کو اعلےٰ تعلیم کہنا نہایت شرم کی بات ہے +

اعلےٰ تعلیم صرف چند کتابوں کے پڑھ لینے اور طوطے کی طرح یاد کرلینے اور امتحان دینے اور انگریزی میں ڈ آئی ٹلی ٹل، بول لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کے لئے سب سے بڑی تعلیم دینے والی عمدہ سوسائٹی ہے۔ جس کا وجود ہندوستان میں نہیں ہے اور شاید صدیوں تک ابھی نہیں ہونے کا۔ ایک دانشمند کا قول ہے۔ کہ انگلستان میں بچوں اور طالب علموں کو کتاب پڑھنے سے اس قدر تعلیم نہیں ہوتی جس قدر کہ کان اور آنکھ سے ہوتی ہے +

تربیت تعلیم کا بہت بڑا رکن ہے۔ مدرستہ العلوم میں ہم نے طالب علموں کی تربیت پر حتے المقدور کوشش کی ہے مگر انگلستان کے کالجوں اور سکولوں کی سی تربیت تو محال ہے البتہ اس قدر کہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت

مدرسۃ العلوم میں تعلیم کے ساتھ عمدہ تربیت بھی ہوتی ہے +

علاوہ اس کے انگلستان کے کالجوں میں اُن طالب علموں کے لئے جو اعلےٰ درجہ کی ڈگری پاتے ہیں۔ اُن علوم میں ترقی کرنے کو جن کا اُن کو مذاق ہے ہزاروں روپیہ سال کی فلوشپ[۱] دی جاتی ہے جس سے وہ فارغ البال ہو کر اس علم میں اعلےٰ درجہ کی ترقی کرتے ہیں۔ اور نئی نئی ایجادوں اور عمدہ عمدہ تصانیف سے ملک کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اور علم کو قوم میں شائع کرتے ہیں + ہندوستان کے کسی کالج میں اس کا وجود بھی نہیں ہے۔ اور ہندوستان کے طالب علم جو کچا پکا علم کالجوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اُس کی ترقی کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اس لئے جو کچھ انہوں نے سیکھا ہے۔ اس میں بھی روز بروز تنزل ہوجاتا ہے۔ ہم نے چاہا تھا کہ مدرسۃ العلوم میں فلوشپ مقرر کرنے کا دستور جاری کریں۔ مگر اس کے لئے سرمایہ بہم نہیں پہنچ سکتا۔ اس سبب سے مجبور ہیں +

اس بیان سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں جو اعلےٰ درجہ کی تعلیم کہلائی جاتی ہے وہ درحقیقت اعلےٰ درجہ کی تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک ادنےٰ درجہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ مگر جہاں کسی نے کوئی ڈگری یونیورسٹی سے پائی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اب میں بہت بڑا عالم ہو گیا کوس لمن الملک الیوم بجانا شروع کردیا۔ مگر وہ آواز طبل سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ناواجب آزادی کو وہ اپنا ایمان بناتا ہے۔ اور یہ سمجھتا بھی نہیں کہ آزادی کیا چیز ہے؟ حب الوطنی کا بہت جوش اس کے دل میں اٹھتا ہے۔ مگر وہ نہیں سمجھتا کہ حب الوطنی کیا چیز ہے؟ اور کیونکر ہوتی ہے۔ پالٹیکس میں جو ایک بہت بڑا اور عمیق فن ہے۔ اُس میں تو وہ اپنے تئیں لاثانی سمجھتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نتیجہ اعلےٰ درجہ کی تعلیم اور تربیت نہ ہونے کا ہے۔ یہ تمام باتیں صرف اُنہیں لوگوں میں نہیں ہوتیں جنہوں نے یونیورسٹی کی کوئی ڈگری پائی ہے۔ بلکہ ان طالب علموں میں بھی جنہوں نے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی شروع کی ہے۔ یہ سب باتیں دیکھا دیکھی اُن میں بھی پیدا ہی ہوتی ہیں۔ شور و شغب کرنا اور گورنمنٹ کی ہر ایک بات میں مخالفت کرنا اور ملک میں غُل مچاتے پھرنا۔ اُن کا شیوہ ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ اس زمانہ میں کانگریس والوں کا شیوہ ہے۔ اگر یہی نتیجہ انگریزی تعلیم کا ہے۔ تو ہم کو خوف ہے۔ کہ اُن پرانے پالیٹشنوں کی رائے پھر زندہ ہو جاویگی۔ اور اس رائے کا زندہ کرنا گورنمنٹ کا فرض ہو جاویگا۔ اور زیادہ تر مسلمان طالب علموں کا نقصان ہوگا۔ جنہوں نے ابھی چند روز سے انگریزی تعلیم پر کسی قدر توجہ کی ہے +

بنگالیوں میں۔ دکن کے برہمنوں میں۔ پارسیوں میں بہت کثرت سے ایسے لوگ ہو گئے ہیں جو اپنی قوم کے بُرے بھلے لوگوں کو سنبھال سکینگے۔ لیکن مسلمانوں کی ایسی حالت نہیں ہے۔ اگر

[۱] وظیفہ۔ ادارہ۔ احمد مخدومی +

مسلمان طالب علموں نے بھی ویسا ہی طریقہ اختیار کیا جیسا کہ اُن قوموں کے طالبعلموں نے اختیار کیا ہے۔ تو اُن کا دین اور دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں رہنے کا +

ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ پنجاب میں جو حضور ملکہ معظمہ قیصر انڈیا کا اسٹیچو[1] قائم کرنے کی تجویز پیش ہوئی تھی اُس میں کیا امر تھا جو اس قدر شور و غوغا کیا گیا۔ اور ایسا طریقہ برتا گیا۔ جو تہذیب کے بالکل برخلاف تھا +

چند لوگوں نے یہ تجویز قرار دی تھی کہ ملکہ معظمہ قیصر انڈیا کا اسٹیچو لاہور میں قائم کیا جائے۔ جو لوگ اس کے بانی تھے انہوں نے اس تجویز کو قطعی قرار دیدیا تھا۔ اور عام مجمع میں اس تجویز کو اس لئے پیش کیا تھا۔ کہ جو لوگ اس کو پسند کرتے ہوں اس میں شریک ہوں۔ اور جو لوگ اپنا روپیہ اس سے بہتر اور مفید کام میں لگانا چاہتے ہوں۔ اُن کو اختیار کلی تھا کہ وہ اس میں شریک ہوں اور چندہ نہ دیں پس کوئی وجہ شور و شغب کرنے اور بے تہذیبی برتنے کی نہ تھی۔ سیدھی بات تھی کہ جن لوگوں کا خیال کسی دوسرے مفید کام کی طرف تھا اس کے چندہ میں شریک نہ ہوتے۔ ہمارے نزدیک اگر سچی اور تحقیقی اعلےٰ تعلیم پائے ہوئے لوگ اس مجمع میں ہوتے تو نہایت خاموشی سے اُن لوگوں کی تقریر سنتے اور پھر ان کو اختیار تھا کہ اُس میں شریک ہوتے یا نہ ہوتے۔ مگر جو کچھ اس مجمع میں ہؤا۔ اُس کے ہونے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ہم تو اپنے کالج کے مسلمان طالبعلموں کو نصیحت کرتے ہیں۔ کہ وہ کبھی پولٹیکل مباحثہ میں کبھی نہ پڑیں۔ پولٹیکل امور میں کسی کالج کے طالبعلموں کا کام نہیں ہے بلکہ اُن کو اپنے تحصیل علوم میں مشغول رہنا چاہئے۔ پولٹیکل امور ایسے نازک اور باریک ہیں۔ کہ بڑی معلومات اور وسیع علم اور بہت سے تجربوں کے بعد اس میں رائے لگانے کا موقع ملتا ہے۔ جن کے معلومات نہایت محدود ہیں۔ جن کا علم ابھی کچا ہے وہ کیا رائے اُس کی نسبت لگا سکتے ہیں +

بہت لوگوں کا خیال ہے کہ جب مسلمان بھی اس قدر تعلیم یافتہ ہو جاوینگے جس قدر کہ بنگالی ہیں تو وہ بھی اُن کے ساتھ ہو جاوینگے۔ اور تعلیم کو ایسا ہی بدنام کرینگے۔ جیسا کہ انہوں نے کیا ہے۔ اگرچہ ہم مسلمانوں کی تعلیم کے دل سے خواہاں ہیں۔ لیکن اگر اس تعلیم کا وہی نتیجہ ہو۔ جو اور قوموں میں ہؤا ہے تو خود ہم کو مسلمانوں کی تعلیم پر کوشش کرنے کا افسوس ہوگا اور ہم کو کہنا پڑیگا کہ ع

بیشک ایں فتنہ است خوابش بردہ بہ

مگر ہم کو اپنے کالج کے مسلمان طالبعلموں سے ایسی توقع نہیں ہے ان کو تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہوتی ہے وہ ہرگز گورنمنٹ کی مخالفت پر کمر نہیں باندھینگے اور گورنمنٹ کی پالیسی کو سمجھینگے اور جانینگے کہ گورنمنٹ کو کیا کیا مشکلیں پیش آتی ہیں اور کس خوبی اور عمدگی سے وہ اُن کو حل کرتی ہے اور جہانتک ممکن ہے رعایا کی آسودگی اور بہبودی اور خوشحالی میں کوشش کرتی ہے اور اگر ہم زیادہ تر لائق۔ زیادہ تر وفادار۔ زیادہ قابل اطمینان گورنمنٹ کے ہونگے تو زیادہ آسائش سے بسر کرینگے پس یہی طریقہ ہمارے مسلمان طالبعلموں کو اختیار

[1] مجسمہ۔ بُت (مخدومی)

تعلیم

تعلیم سے ہماری مراد موافق عرف عام کے لکھنا پڑھنا سیکھنے سے ہے۔ ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں آدمی مختلف مقاصد سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہے ہیں +

عام مقصد جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے۔ خواہ تعلیم پانے والے خود اس پر متوجہ ہوں یا اطفال کے مربیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو۔ یہ ہے کہ اُن کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہوتی ہے کہ ایک جاہل کندۂ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوئی ہو زندگی کے کاروبار میں اُس کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہوتی ہے +

اُن تعلیم پانے والوں میں لاکھوں آدمی تو ایسے ہوتے ہیں کہ ادنےٰ درجہ تعلیم تک پہنچکر اور کچھ متوسط درجہ کی تعلیم تک پہنچکر رہ جاتے ہیں۔ اور چند ایسے ہوتے ہیں۔ کہ متوسط درجہ کی تعلیم سے آگے بڑھتے ہیں اور اپنے مذاق کے موافق علم کی شاخوں میں سے کسی شاخ کی تکمیل پر مائل ہوتے ہیں۔ کوئی شاعر بننا چاہتا ہے۔ کوئی ادیب۔ کوئی فلسفہ میں ترقی کرتا ہے۔ اور کوئی ریاضیات میں۔ اور کوئی دینیات میں۔ وعلےٰ ہذا القیاس۔ مگر ہر ایک کے ساتھ حصول معاش کا خیال لگا رہتا ہے۔ اور جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے۔ اس کو ذریعہ حصول معاش ضرور سمجھتا ہے +

تعلیم بغیر اس کے کہ اُس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی زبان اختیار کی جاوے غیر ممکن ہے۔ جس زمانہ میں جس زبان کا عروج ہوتا ہے وہی زبان اس کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ یہ ایک کلیّہ قاعدہ ہے کہ جس ملک میں جو زبان حکومت کرتی ہے۔ اسی زبان کا عروج ہوتا ہے۔ خلفائے بنی امیہ اور بنی عبّاس کے زمانہ میں عربی زبان کا عروج تھا۔ ہر شخص اُسی زبان میں علوم کو سکھنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانہ میں ہندوستان میں سنسکرت زبان کا عروج تھا۔ اُسی کو لوگ اختیار کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی عملداری ہندوستان میں ہوئی۔ تو فارسی زبان کا عروج ہوا۔ اور سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا۔ اب ہندوستان میں انگریزی حکومت ہے جس کی زبان انگریزی ہے۔ اور اسی زبان کو عروج ہے۔ اس لئے ہر شخص اسی زبان کے اختیار کرنے پر مائل ہے۔ ہاں مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں بہت کچھ کوتاہی کی۔ اس کے کچھ ہی سبب ہوں۔ مگر اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا۔ کہ وہ اپنی غلطی سے انگریزی زبان پڑھنے کو مخالف مذہب اسلام سمجھتے تھے۔ مگر جب سے یہ خیال کم ہوگیا یا دنیوی ضرورت نے اُنھیں مجبور کیا اُسی وقت سے مسلمانوں نے بھی انگریزی زبان میں تعلیم اختیار کرنی شروع

کردی ہے۔ مگر بہت سے مسلمان مذہب کو دُنیوی ضرورت سے مُقدّم سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اُن میں یہ خیال کہ انگریزی پڑھنی مذہب اسلام کے برخلاف ہے۔ کم ہوگیا ہے۔

اکثر حکام کا اور نیز بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ لوگ صرف سرکاری نوکری حاصل کرنے کو انگریزی پڑھتے ہیں۔ مگر غور کرنے کی بات ہے کہ ہر سال ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے سینکڑوں بی۔ اے اور ایم اے ڈگری پاتے ہیں۔ اور اُن کو یقین کامل ہوتا ہے۔ کہ گورنمنٹ پاس اس قدر نوکریاں نہیں ہیں کہ وہ اس جم غفیر بی۔ اے اور ایم۔ اے ڈگری یافتوں کو دے سکے۔ پس یقینی ڈگری یافتہ طالب علموں کو اس کا یقین ہے کہ سب کو سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ باوصف اس یقین کے جو وہ انگریزی پڑھنے پر مشغول ہیں تو ضرور ہے کہ سوائے ملازمت سرکاری کے اور کسی ذریعہ سے بھی ان کو معاش حاصل کرنے کا خیال ہے۔ یا اس بات کا یقین ہے کہ انگریزی پڑھا ہوا ان انگریزی پڑھے ہوئے سے دنیوی کاروبار کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔ بہرحال یہ بات غلط ہے کہ ہر ایک بی۔ اے اور ایم۔ اے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے پڑھتا ہے اور نہ ملنے کے سبب سرکار سے ناراض ہوتا ہے کیونکہ اُس کو پہلے سے یقین ہے کہ سرکار سب کو نوکری نہیں دے سکتی۔ ہاں جب موقع ہوتا ہے۔ تو ہر ایک سرکاری ملازمت ملنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کو ضرور کرنی چاہئے۔

اس زمانہ کی تعلیم میں جو بذریعہ انگریزی زبان کے ہوتی ہے۔ اور اگلے زمانہ کی تعلیم میں جو بذریعہ عربی زبان کے ہوتی تھی یہ فرق ہے کہ اگلے زمانہ میں تعلیم کا سامان ایسا موجود اور مہیّا تھا کہ ہر شخص جو علم کی کسی شاخ میں یا شاخوں میں اس زمانہ کے موافق اعلےٰ درجہ کی تعلیم پانا اور اس فن کا ماسٹر ہونا چاہے تو ہوسکتا تھا۔ اور سوسیٹی جو اُس زمانہ میں موجود تھی۔ اُس تعلیم کی مدد کرتی تھی۔ اور اس پر عمدہ اخلاقی اثر ڈال کر اُس کو اس سوسیٹی کے لائق کرلیتی تھی۔ اگلے زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق اور حسن معاشرت کے ایسی عمدہ تھی کہ اُس میں کوئی نقص اس زمانہ میں بھی نہیں نکالا جاسکتا مگر افسوس ہے کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ وہ قائم نہ رہی۔

اس زمانہ کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی کسی شاخ میں اعلےٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے۔ تو اعلےٰ درجہ کی تعلیم پاکر اس فن کا ماسٹر ہوسکے۔ ہندوستان میں اعلےٰ تعلیم دینے والی وہ یونیورسٹیاں ہیں۔ جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ وہ بلاشبہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اُس تعلیم کو اعلےٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے۔ بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے۔ اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔

بالفعل جو باتباع احکام یونیورسٹیوں کے اس کے ماتحت کالجوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ زیادہ تر کتابی اور دماغی تعلیم سے متعلق ہے۔ اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ ضرور وہی ہونا چاہئے۔ جو مسٹر کرول نے اپنے لکچر میں بیان کیا ہے اور جس کو اودھ اخبار نے اُردو زبان میں لکھا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ "تعلیم کا منشاء یہ نہیں ہے کہ چند آدمیوں کی دولت بڑھ جائے یا آنکہ غربا کے بمقابلہ باقیماندہ اشخاص کی زیادہ رعایت کی جائے۔ اور نہ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگ صرف اپنی باہمی محافظت کریں یا سوداگری اور تجارت ہی کو ترقی دیں۔ بلکہ تعلیم کی خاص غایت اور اصل منشا یہ ہے۔ کہ لوگ نیک محض اور عمدہ قسم کے باشندے ہو جاویں۔ اور وہ خاموشی حاصل کریں۔ جو زندگی کے بے داغ رہنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور لوگوں کے سوشیل اور اخلاقی خصائل کی تکمیل کریں۔ اور اُن بھاری اور عمدہ کاموں کا حوصلہ دلائیں۔ جن سے ملک کی عزت اور زینت ہوتی ہے"۔

سرولیم میکورتھ ینگ[5] نے جو ڈگری یافتہ طالب علموں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اس کا حاصل بھی وہی ہے جو مسٹر کرول نے اپنے لکچر میں کہا تھا۔ سرولیم میکورتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالبعلموں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اُن کی ڈگریاں اس بات کے لئے ہیں۔ کہ وہ اپنے یومیہ معاملات اور گفتگو میں معزز برتاؤ اختیار کریں۔ اخلاق اور عمدہ تعلیم کی ترقی میں مدد دیں۔ سوشیل انتظام اور اپنے ہمجنسوں کی بہبودی کے قائم رکھنے میں کوشاں رہیں۔ المختصر ایک بھاری سلطنت کے برآوردہ شہریوں کے فرائض ادا کرتے رہیں"۔

مگر ہماری رائے میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے۔ ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی علما اور نیک خدا پرست رحم دل۔ نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی وہ مدت ہوئی کہ مُردہ ہو گئی ہے۔ اور نئی سوسائٹی جو زمانہ حال کے موافق ہو۔ اب تک قائم نہیں ہوئی یا مکمل نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ نتائج جس کا ذکر مسٹر کرول نے اپنے لکچر میں کیا یا سرولیم میکورتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالبعلموں سے خواہش کی حاصل نہیں ہوتی۔

ہم اس بات کو جیسا کہ اودھ اخبار نے لکھا ہے نہایت مفید اور ضروری سمجھتے ہیں کہ "اسکول ماسٹروں کو چاہئے کہ اپنے شاگردوں کے نقش ذہن کرتے رہیں۔ کہ وہ اعلےٰ درجہ کا چلن اور شریفانہ اولوالعزمیاں اختیار کریں۔ اور اسی طرح ہمارے کالجوں کے پروفیسروں کو بھی منجملہ ایسے لوگوں کے ہونا چاہئے جن میں خیالات عالیہ پائے جاتے ہوں"۔ مگر ہماری رائے میں جب تک کہ خود اسی قوم کے چند لوگ اُس قوم کی سوسائٹی کے مہذب کرنے پر آمادہ نہ ہوں اور دلی سعی و کوشش نہ کریں سوسائٹی کی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ اور یہی سبب ہے کہ باوجودیکہ کئی قرن گورنمنٹ کو

[5] پنجاب کے لفٹنٹ گورنر جو ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۲ء تک رہے (احمد مخدومی)

ہندوستانیوں کو تعلیم دیتے ہوئے گذرے مگر ان کی سوسائٹی کی حالت اب تک درست نہیں ہوئی ÷

نہایت مشکل یہ ہے کہ دنیا میں کسی قوم کی سوسائٹی اور سوشیل حالت ایسی نہیں ہے کہ جس میں ایسے امور بھی شامل نہ ہوں جن کی بنا غلط یا صحیح طور پر مذہبی امور پر مبنی ہونی نہ کہی جاتی ہو۔ پس اگر وہ امور ترقی سوسائٹی کے مانع ہیں۔ اور غلطی سے اُن کی بنا مذہبی امور پر کہی جاتی ہے۔ تو جب تک اُسی قوم کا کوئی شخص اس غلطی کو ظاہر نہ کرے اور اُس مانع کے رفع کرنے میں کوشش نہ کرے۔ تو وہ رافع نہیں ہوسکتی۔ غیر قوم کے شخص کا اس امر مانع پر متنبہ کرنا گو وہ کیسا ہی سچ کہتا ہو مخالف اثر پیدا کرتا ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ وہ شخص بسبب اختلاف قومی یا مخالفت مذہب کے ایسا کہتا ہے۔ اگرچہ ہم قوم اور ہم مذہب والے پر بھی ہزاروں شخص طرح طرح کے اتہام لگاتے ہیں اور اس کی بات کی سماعت نہ ہونے پر کوشش کرتے ہیں۔ اور گورنمنٹ تو ایسی کوئی بات جس سے مذہب میں مداخلت کرنے کا شُبہ بھی ہو اختیار نہیں کرسکتی۔ غرضیکہ اخلاقی اور شریف النفسی کی تعلیم عمدہ سوسائٹی پر منحصر ہے۔ اور انگریزی گورنمنٹ سوائے تعلیم دینے کے اور کوئی طریقہ اختیار نہیں کرسکتی۔ جس سے ہندوستانیوں میں سوسائٹی کی حالت اچھی ہو اور عمدہ سوسائٹی ان کی بن جاوے ÷

دماغی تعلیم جس کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا کچھ شُبہ نہیں ہے کہ انسان کو انسان اور اس کی عقلی اور دماغی قوتوں کے کامل اور اُس کے اخلاق کو عمدہ بنانے میں بہت کچھ مدد کرتی ہے۔ مگر جب مسئلہ حصول معاش پر نظر کی جاتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ یقینی امر ہے کہ محض علمی پیشوں میں حصول معاش کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں ہے۔ اور اس لئے اُن کا اور نیز ہمارے حُکام کا اِس طرف خیال جاتا ہے کہ حرفت اور فن کی تعلیم کو جسے سینز اور ٹیکنیکل ایجوکیشن سے تعبیر کیا جاتا ہے زیادہ وسعت دی جاوے ÷

ٹیکنیکل[1] ایجوکیشن کے معنی تو ہم آج تک نہیں سمجھے کہ اُس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس کی مراد حرفوں کی تعلیم سے ہے جیسے لوہاری۔ نجاری۔ نوربافی وغیرہ وغیرہ تو اس کی ضرورت تو ہم ہندوستان میں بہت کم پاتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہندوستان میں نہیں ہے۔ اگر یورپ کو یا اور کسی ملک کو اس باب میں کچھ تفوّق ہے۔ تو وہ صرف اس وجہ

[1] اس انگریزی لفظ کا ترجمہ اردو میں دست کاری، صنعت و حرفت کی تعلیم ہو سکتا ہے۔ مثلاً نجاری۔ آہن گری۔ بافندگی۔ رنگ سازی۔ صابون گری۔ موٹر کا کام۔ شیشے کا کام۔ دیاسلائی بنانا یہ اور ایسے ہی اور کام ٹیکنیکل تعلیم کے تحت میں آئینگے ÷ (احمد مخدومی)

سے ہے کہ جو کام ہندوستان میں ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ وہ اُن ملکوں میں کلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مگر کلیں قائم کرنے والے وہ لوگ نہیں ہیں جو ان میں کام کرتے ہیں۔ بلکہ کلوں کے قائم کرنے والی ایک جدا جماعت ہے۔ ہندوستان میں اگرچہ کہیں کہیں ایسی جماعتیں قائم ہوئی ہیں۔ مگر ہندوستان میں عام طور پر ایسی جماعتوں کا قائم ہونا ظاہرا بہت دور اور بعض وجوہ سے اگر ناممکن نہیں تو مشکل تو ضرور معلوم ہوتا ہے۔

سینس[1] بلاشبہ نہایت عمدہ چیز ہے۔ اور سینس کا جاننے والا آج کل کے زمانہ میں قریب قریب ہر حرفت پر پورا پورا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اور معاش حاصل کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ اُس کے پاس ہوتا ہے۔ جیسا کہ یورپ کے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ مگر یورپ کے ملکوں کا قیاس ہندوستان پر نہیں ہو سکتا۔ یورپ میں ہر قسم کے متعدد کارخانے موجود ہیں۔ اور اس لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں سینس کی تعلیم دینا فائدہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ ہر قسم کے سینس جاننے والے کے لئے ہر قسم کے کارخانے موجود ہیں جن میں وہ جا سکتا ہے۔ اور اپنی معاش پیدا کر سکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں اس قسم کے کارخانے نہیں ہیں اور نہ ابھی ان کے ہونے کی توقع ہے۔ پس سینس جاننے والا بجز اس کے کہ سینس کا عالم ہو کر اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور کوئی ذریعہ معاش کا حاصل نہیں کر سکتا۔ گورنمنٹ ڈاکٹری۔ انجینیری۔ نقشہ نویسی وغیرہ کی جو ٹیکنیکل ایجوکیشن یا سینس میں داخل ہیں۔ بقدر ضرورت اس ملک کے تعلیم دیتی ہے۔ اور اس ذریعہ سے وہ لوگ معاش بھی پیدا کرتے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ تعلیم کی نہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں گنجایش ہے اور نہ وہ اُس تعلیم سے کچھ معاش پیدا کر سکتے ہیں۔

بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلےٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی اور اخلاقی اور سوشیل حالت کی درستی کی ہے جو ابھی تک نہیں ہوئی۔ یا پورے طور پر نہیں ہوئی۔ اس کے بعد باقی امور لحاظ کے قابل ہیں۔ پس ہم کو مناسب نہیں ہے کہ ہم دفعتہً سب امور کا ہونا چاہیں بلکہ جو کام ہم کو پہلے کرنا ہے اس کو مُقدم سمجھیں۔ اور اس کے بعد جو کام کرنے ہیں وہ کریں۔

---

[1] علوم حکمیہ (احمد بابا مخدومی)

خلافت



...للہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں تین صفتیں جمع تھیں +

اول نبوت یعنی شریعت کے احکام کا خدا کی طرف سے آپ کے پاس پہنچنا +

دوم - اُن احکام کی لوگوں میں تبلیغ +

سوم - ملکی سیاست اور نفاذ احکام اور محافظت احکام شریعت کی قوت اور اہل ملک کی حفاظت اور قوت اور طاقت سے مخالفین کی مدافعت +

پہلا - امر رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر ختم ہو گیا +

اور اس امر میں کوئی شخص رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ اور نائب نہ تھا - اور نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے +

دوسرے امر میں تمام فقہاء اور علماء اور محدثین جو احکام شریعت محمدیہ علے صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی لوگوں میں تبلیغ کرتے ہیں - رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ یا نائب متصور ہو سکتے ہیں - اور اسی واسطے بعض مفسرین نے آیت یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں جو لفظ اُولِی الْاَمْر کا ہے - اس میں ائمۂ اہل بیت علیہم السلام اور علماء اور فقہاء کو داخل کیا ہے +

تیسرے امر میں وہ لوگ جو کسی ملک کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہیں اور اس کی سیاست کے مختار ہیں اور نفاذ احکام اور محافظت احکام شریعت کی قوت اور اہل ملک کی حفاظت اور قوت اور طاقت سے مخالفین کی مدافعت کر سکتے ہوں - وہ لوگ اس امر میں خلیفہ یا نائب رسول تصور ہو سکتے ہیں - بشرطیکہ وہ خود صفات اور اخلاق محمدی سے موصوف اور تمام احکام شرعی کے پابند ہوں - اور تقدس ظاہری اور باطنی اُن کو حاصل ہو - اور بعض مفسرین نے سرداران لشکر اسلام کو بھی اولی الامر میں شامل کیا ہے جن کے ماتحت بہت سے لوگ ہوتے ہیں +

سلاطین اسلام جو کسی ملک پر سلطنت رکھتے ہوں ممکن ہے کہ اس تیسرے امر کے لحاظ سے اپنے تئیں خلیفہ کے لقب سے ملقب کریں - مگر اُن کی خلافت یا سلطنت اسی ملک پر اور اُسی ملک کے مسلمان باشندوں پر محدود رہیگی جو ان کے قبضۂ اقتدار میں ہے نہ اُس ملک کے مسلمان باشندوں پر جو اُن کے قبضۂ حکومت میں نہیں ہیں - اس لئے کہ خلیفہ کو ضرور لازم ہے کہ وہ ملک پر قبضہ اور سلطنت رکھتا ہو - اور احکام حدود و قصاص اس میں جاری کر سکتا ہو -

اس کا حکم اُس میں جاری ہو۔ دین کی حمایت کرتا ہو۔ دشمنوں کے ہاتھ سے اس ملک کو اور اس ملک کے باشندوں کو محفوظ رکھ سکتا ہو اور اُس ملک میں امن قائم رکھنے کی قوت اُس کو حاصل ہو۔ پس جس ملک میں کسی مسلمان بادشاہ کو ایسا اختیار اور اقتدار نہ ہو۔ وہ اس ملک کے یعنیا اُس ملک کے مسلمان باشندوں کے لئے خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ نہ خلیفہ کہلایا جا سکتا ہے ؛

سلطان ترکی کے خلیفہ ہونے کی نسبت جو اس پر بحث کی جاتی ہے کہ وہ نسل قریش سے نہیں ہیں اور جو لوگ ان کو خلیفہ جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ روایت جس میں خلیفہ کے قریشی النسل ہونے کا ذکر ہے صحیح نہیں ہے۔ ہم ان تمام بحثوں سے قطع نظر کرتے ہیں۔ اور سلطان کو خلیفہ تسلیم کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اگر وہ خلیفہ ہیں تو اس ملک کے اور اس ملک کے مسلمان باشندوں کے خلیفہ ہو سکتے ہیں۔ جن میں ان کی حکومت ہے اور جس میں اُن کو قتل وقصاص اور احکام دین کے قائم رکھنے کا اختیار اور اقتدار حاصل ہے نہ اُس ملک کے جہاں اُن کو مطلق اقتدار اور اختیار حاصل نہیں ہے نہ وہ قتل وقصاص کے احکام کو جاری کر سکتے ہیں نہ دین کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ نہ وہاں کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ایسے ملک میں وہ شرط نہیں پائی جاتی۔ جو خلیفہ ہونے کے لئے ضرور ہے۔ اور اس لئے وہ اس ملک۔ یا اس ملک کے مسلمان باشندوں کے لئے خلیفہ نہیں ہو سکتے ؛

ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے گورنمنٹ انگریزی کی رعیت ہیں۔ اور گورنمنٹ انگریزی میں مستامن ہو کر رہتے ہیں۔ گورنمنٹ انگریزی نے ہم کو امن دیا ہے اور ہم کو ہر طرح پر مذہبی آزادی بخشی ہے۔ باوجودیکہ گورنمنٹ انگریزی عیسائی مذہب رکھتی ہے۔ اگر کوئی عیسائی مسلمان ہو جاوے تو وہ اسی طرح کچھ مزاحمت نہیں کرتی جس طرح کہ کسی مسلمان کے عیسائی ہو جانے سے نہیں کرتی۔ مشنری پادریوں کو گورنمنٹ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ جس طرح کہ وہ وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح سینکڑوں مسلمان مذہب اسلام کا وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان عیسائی ہو جاتا ہے تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی عیسائی بھی مسلمان ہو جاتا ہے۔ پس گورنمنٹ انگریزی نے ہم مسلمانوں کو جو بطور رعیت کے مستامن ہو کر اُس کی عملداری میں رہتے ہیں۔ کافی طور پر مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ علاوہ اس کے گورنمنٹ انگریزی میں ہماری مال وجان کی حفاظت ہوتی ہے۔ ہمارے تمام حقوق جو نکاح طلاق وراثت وصیت۔ ہبہ و وقف سے متعلق ہیں بموجب شرع اسلام کے ہم کو ملتے ہیں۔ گو کہ اس قسم کے مقدمات ایک عیسائی حاکم کے سامنے پیش ہوں۔ کیونکہ عیسائی حاکم مجبور ہے کہ ان کو بموجب شرع اسلام کے فیصل کرے۔ اور اس لئے ہمارا مذہبی فرض ہے کہ

ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیرخواہ اور وفادار ہیں اور کوئی بات قولاً و فعلاً ایسی نہ کریں۔ جو گورنمنٹ انگریزی کی خیرخواہی اور وفاداری کے برخلاف ہو۔

سلطان عبدالحمید خاں خلد اللہ ملکہ کی ہم رعیت نہیں ہیں۔ نہ اُن کو ہم پر یا ہمارے ملک پر کسی قسم کا اقتدار حاصل ہے۔ پس وہ بلاشبہ ایک مسلمان بادشاہ ہیں۔ اور بوجہ اتحاد اسلامی کے ہم اُن کی بھلائی سے خوش اور بُرائی سے ناخوش ہوتے ہیں۔ مگر کسی طرح نہ شرعاً نہ مذہباً ہم پر خلیفہ ہیں نہ خلیفہ ہو سکتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی حق خلافت ہے تو وہ اُسی ملک پر اور اُسی ملک کے مسلمانوں پر محدود ہے جو اُن کی عملداری میں رہتے ہیں۔

تاریخ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جن مسلمان بادشاہوں نے لقب خلیفہ کا اختیار کیا۔ اُن کی خلافت اُسی ملک اور اُسی ملک کے باشندوں پر محدود رہی ہے جو اُن کی سلطنت میں شامل اور اُن کے قبضۂ اقتدار میں داخل تھے اور جو ملک اُن کی سلطنت میں نہ تھے اُن کی خلافت یا امامت یا سلطنت سے اُن کو کچھ تعلق نہ تھا۔ چنانچہ اس مقام پر ہم تاریخانہ طور سے خلفاء کے سلسلہ کو بیان کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوگا کہ اُن کی خلافت اُسی حد تک محدود تھی۔ جس قدر ملک کہ اُن کے قبضہ میں تھا۔

حضرت ابوبکر جو بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہوئے بلاشبہ وہ پسند فرماتے تھے کہ خلیفۂ رسول اللہ کہلاویں۔ مگر جب حضرت عمر اُن کے جانشین ہوئے تو یہ بات پسندیدہ نہیں تھی کہ حضرت عمر خلیفۂ خلیفۂ رسول اللہ کہلاویں۔ اس لئے بجائے اُس لقب کے امیرالمومنین کا لقب اختیار کیا گیا جس کے معنی ہیں مسلمانوں کے سردار۔ یہ ہی لقب حضرت عمر کا اور حضرت عثمان اور حضرت علی مرتضٰے کا اور حضرت امام حسن علیہم السلام کا رہا۔

جب حضرت امام حسنؓ نے خلع خلافت کی اور معاویہ بن سفیان کے ہاتھ حکومت آئی اور ۴۱ھ ہجری مطابق ۶۶۱ء عیسوی کے دمشق دارالخلافہ ٹھیرا۔ اُس وقت ان کا لقب بھی امیرالمومنین رہا اور آج تک امیر معاویہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ مگر چونکہ خلیفہ کا لقب زیادہ مقدس سمجھا جاتا تھا کہ اس میں اشارہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا نکلتا تھا۔ اس لئے وقتاً فوقتاً جو کوئی بنی اُمیہ میں سے جانشین ہوا سب نے اپنا لقب خلیفہ کا اختیار کیا۔ خلفائے جو درحقیقت بمعنی سلطان کے تھا۔

اُس کے بعد بنی عباس نے بنی امیہ کو مغلوب کیا اور ۱۳۲ھ ہجری مطابق ۷۵۰ء عیسوی کے السفاح نے حکومت حاصل کی اور المنصور نے بجائے دمشق کے بغداد کو

دار الخلافہ بنایا اور جو لوگ وقتاً فوقتاً بنی عباس میں سے جانشین ہوتے گئے سب نے اپنا لقب خلیفہ کا اختیار کیا۔ خلفائے بنی امیہ معدوم ہو گئے۔ اور خلفائے بنی عباس کا دور دورہ ہو گیا +

المقتدر باللہ عباسی بغداد میں خلیفہ موجود تھا اسی کے عہد میں ایک خلافت افریقہ میں قائم ہو گئی یعنی ۲۹۷ھ ہجری مطابق ۹۰۹ عیسوی کے عبد اللہ المہدی نے افریقہ میں بمقام قیروان خلافت کی بنیاد ڈالی اور ۳۴۱ھ ہجری مطابق ۹۵۲ عیسوی کے المعز باللہ نے قیروان سے مصر کو دار الخلافہ ٹھیرایا۔ عبد اللہ المہدی اور اس کے جانشین سب علوی تھے اور سب نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ اب اسلامی دنیا میں دو خلیفہ مستقل با اقتدار و اختیار پیدا ہو گئے۔ ایک خلفائے بنی عباس بغداد میں دوسرے خلفائے علویین قیروان یا مصر میں +

۱۳۸ھ ہجری مطابق ۷۵۵ء کے عبد الرحمن الداخل اندلس میں داخل ہوا۔ چند روز تک تو اس کے جانشینوں نے خلیفہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔ مگر جب المقتدر باللہ کے زمانہ میں جو بغداد میں خلیفہ تھا۔ یعنی ۳۰۰ھ ہجری مطابق ۹۱۲ء کے عبد الرحمن ناصر تخت پر بیٹھا اُس نے اور اُس کے بعد جو جانشین ہوئے۔ اُنہوں نے لقب خلیفہ کا اختیار کیا۔ جن کا دار الخلافہ قرطبہ تھا +

اب اسلامی دنیا میں تین خلیفہ مستقل اور با اقتدار و اختیار پیدا ہو گئے۔ ایک خلفائے بنی عباس بغداد میں اور خلفائے علویین مصر میں اور عبد الرحمن ناصر اور اُس کے جانشین اندلس میں۔ یہ تینوں خلیفے اپنے تئیں اسی ملک کا خلیفہ سمجھتے تھے۔ جو اُن کے قبضۂ اقتدار میں تھے۔ ہر ایک خلیفہ کے دربار میں قاضی اور مفتی سب موجود تھے۔ اور اپنے اپنے ملک کے خلیفہ کے حکم اور مرضی سے فقہ کے احکام جاری کرتے تھے۔ بغداد کی عباسی خلافت میں عدالتیں فقہ حنفی پر عملدرآمد کرتی تھیں۔ مصر کی فاطمی حکومت میں فقہ اسمٰعیلی کا رواج تھا اور اندلس کے اموی خاندان کی علاقتوں میں فقہ مالکی جاری تھی۔ اور وہ ہر ایک کی خلافت کو اُس ملک میں جو اُس کی سلطنت میں تھا جائز قرار دیتے تھے۔ پس ان تمام حالات سے ظاہر ہے کہ سلطان عبد الحمید خاں خلد اللہ ملکہ نہ ہم مسلمانوں کے لئے جو رعایائے گورنمنٹ انگریزی ہیں خلیفہ ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ سلطان ترکی محافظ حرمین شریفین ہیں بلکہ حافظ احترام شریفہ ہیں جن میں مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ اور بیت المقدس یعنی یروشلم جو مقام مقدس یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا ہے داخل ہیں۔ مگر اس سے اور

خلیفہ ہونے سے کچھ تعلق نہیں ہے ✦

بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام یا خلیفہ ہر زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک ہی ہونا لازم ہے۔ اور اس لئے سلطان ترکی کو وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا خلیفہ قرار دیتے ہیں مگر یہ محض غلط رائے ہے۔ کیونکہ اس بات کا ثبوت کہ تمام دنیا میں ایک امام یا خلیفہ ہو نہ قرآن مجید سے ہوتا ہے نہ کسی حدیث سے۔ کوئی شخص نہ آج تک ایسا ہوا ہے اور شاید ہو گا بھی نہیں جس کی حکومت وسلطنت تمام دنیا پر ہو۔ مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں۔ اور جب ایسے ملکوں میں ہوں جن میں کسی مسلمان بادشاہ کی حکومت وسلطنت نہیں ہے تو وہاں نہ کوئی مسلمان اُن مسلمانوں پر جو وہاں رہتے ہیں خلیفہ ہو سکتا ہے نہ امام زمان جس کو مرادف خلیفہ تصور کیا ہے۔ اور یہ رائے تاریخ کے بھی برخلاف ہے۔ کیونکہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ ایک وقت میں تین خلیفے گذرے ہیں۔ جن کو اُن ملکوں کے رہنے والے مسلمان علما وقاضی ومفتی جو اُن کی حکومت میں رہتے تھے خلیفہ برحق قرار دیتے تھے ✦

تمام دنیا میں ایک امام یا خلیفہ کا ہونا

ہاں مسلمان یہ سمجھتے ہیں۔ کہ قیامت کے قریب جب حضرت عیسےٰ آسمان سے اُتریں گے اور حضرت امام مہدی پیدا یا ظاہر ہونگے تو حضرت امام مہدی تمام دنیا کے امام ہونگے۔ اُس وقت جو زندہ رہیگا وہ دیکھیگا کہ کیا ہوتا ہے (مگر ہمارے نزدیک تو نہ حضرت عیسےٰ آسمان پر سے اُترنے والے ہیں نہ مہدی موعود پیدا یا ظاہر ہونے والے ہیں) کیونکہ جتنی روایتیں اس باب میں ہیں وہ ثابت نہیں ہیں اور اکثر اُن میں کی موضوع ہیں ✦

نزول عیسےٰ ومہدی کی اکثر حدیثیں موضوع ہیں

بعض روایتوں پر استدلال کیا جاتا ہے کہ ہر مسلمان کو امام زمان کا جاننا اور اس سے بیعت کرنا واجب ہے۔ گو یہ روایتیں بھی قابل وثوق اور لائق اعتبار نہیں ہیں۔ مگر ہم اُن میں کچھ بحث کرنا نہیں چاہتے اور اُن کے تسلیم کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے خلیفہ کا جس کی سلطنت میں وہ رہتا ہے۔ جاننا اور اس سے بیعت کرنا ضرور ہے (بیعت کا مطلب صرف اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ ہم اس کے مطیع اور تابعدار ہیں) اور جو شخص جس کی حکومت میں رہتا ہو اس کا فرض ہے کہ اُس کی تابعداری کرے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ اس کی حکومت میں نہیں رہتے وہ بھی اُس کی تابعداری کا اقرار کریں۔ غرضکہ کوئی مسلمان بادشاہ اُن مسلمانوں کے لئے جو اُس کی سلطنت میں نہیں رہتے خلیفہ نہیں ہو سکتا ✦

بیعت کا مفہوم

خلافت اور خلیفہ

خلافت کے معنی جانشین ہونے کے ہیں۔ اور خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو کسی کا جانشین ہو۔ مگر اب خلافت ایک مذہبی لفظ ہو گیا ہے۔ اور خلیفہ بھی ایک مذہبی عہدہ کا خیال کیا جاتا ہے۔ ابتدا اس کی رومن کیتھولک مذہب سے ہوئی۔ سب سے بڑا افسر سینٹ پیٹرز چرچ کا حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے حواری سینٹ پیٹرز کا جانشین سمجھا جاتا ہے جس کو پوپ کہتے ہیں۔

رومن کیتھولک کے اعتقاد میں پوپ معصوم ہے۔ یعنی اُس سے کوئی غلطی نہیں ہوتی رومن کیتھولک کا یہ اعتقاد ہے کہ پوپ کو دین و دُنیا اور نجات آخرت تینوں باتوں کے اختیارات حاصل ہیں۔ اور ہر ایک پوپ کو یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس زمانہ میں بھی جو ہولی پوپ ہے اس کو بھی یہ اختیارات حاصل ہیں۔

دنیوی امور میں اختیار ہونا تو ایک ظاہری امر ہے۔ دینی اختیار ہونے سے یہ مراد ہے۔ کہ جو حکم وہ دینی امور میں صادر کرے وہی مانا جاوے خواہ وہ پہلے احکام دینی کے موافق ہو یا برخلاف اور گو کہ اُس نے ناجائز امر کو جائز۔ یا جائز امر کو ناجائز عموماً کر دیا ہو۔ یا کسی شخص کے لئے کر دیا ہو۔ نجاتِ آخرت سے یہ مراد ہے۔ کہ اُس کو لوگوں کے گناہ معاف کر دینے کا جب کہ وہ پوپ کے سامنے اپنے گناہ بیان کرے اور معافی چاہیں۔ بالکل اختیار ہے۔ اور جب پوپ اُن گناہوں کو معاف کرے۔ تو وہ شخص ایسا ہی پاک صاف ہو جاتا ہے۔ کمَن لَّا ذَنبَ لَہٗ۔ اور آخرت میں اُن گناہوں کی بابت کچھ اس سے مواخذہ نہیں ہو گا۔ اور یہ بھی پوپ کو اختیار ہے۔ کہ مرے ہوئے لوگوں کو گناہوں سے نجات دے اور بہشت میں داخل کرے۔ اسی لئے پوپ کی ٹوپی گول اور لمبی ہوتی ہے۔ اس کی چوٹی پر صلیب کی صورت بنی ہوتی ہے اور ٹوپی کے گرد تین تاج ہوتے ہیں۔ پہلے تاج سے دنیوی اختیار مراد ہے۔ اور دوسرے تاج سے دینی اختیار۔ اور تیسرے تاج سے آخرت کا اختیار۔

مسلمانوں میں رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کے جانشین قرار پائے۔ اور ان کو خلیفہ رسول اللہ کا لقب بھی ملا۔ مگر وہ ایسے خلیفہ نہیں تھے۔ جیسا کہ رومن کیتھولک اپنے پوپوں کو سمجھتے ہیں۔ یعنی ان کو دینی اختیارات کچھ نہیں تھے۔ نہ وہ حرام کو حلال کر سکتے تھے نہ حلال کو حرام۔ صرف ان کا کام یہ تھا۔ کہ جو دینی احکام رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمائے ہیں۔ اُن کی تعمیل اور تعلیم کی کوشش کریں۔ اور مسلمانوں کے گروہ کی جو ضروریات ہیں اُن کو پورا کریں۔ اور مطلق ان کو اختیار نہ تھا۔ کہ کسی دینی حکم کو منسوخ کریں۔ یا کوئی نیا حکم دین میں جاری کریں۔ اور آخرت کا خیال ان کو مطلق نہیں تھا۔ نہ وہ کسی کے گناہ معاف کرسکتے تھے۔ نہ کسی کو بخشوا سکتے تھے +

ہولی پوپ جو دینی حکم دیتا تھا۔ اُس میں کسی کو چون و چرا کرنے کی مجال نہ تھی۔ مگر اسلام میں جن کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ ان کے احکام دینی میں ہر شخص کو حق تھا (کہ اگر وہ خدا اور رسول کے حکموں کے برخلاف ہوں تو اُن کو نہ مانے) اور اُس پر حجت کریں۔ غرضکہ جن کو مذہب اسلام میں خلیفہ کہا جاتا ہے۔ اُن کو خلافت فی النبوۃ۔ یعنی مذہبی احکام کے وضع کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ بلکہ صرف وہ خلیفۃ النبی تھے۔ جس سے یہ مراد ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو قائم رکھیں۔ اور مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کریں۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ حضرت ابوبکر صدیق رض کو خلیفہ رسول اللہ کہا گیا ہے۔ مگر حضرت عمر رض کے زمانہ سے یہ لفظ متروک ہوگیا۔ اور بجائے اس کے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا گیا۔ جو بالکل صحیح اور نہایت موزون اور واقع کے مطابق تھا +

حضرت علی مرتضےٰ رض کے زمانہ تک اور ان کے بعد بھی چند روز تک بجائے خلیفہ کے امیر المؤمنین کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ مگر اُن کے بعد اور امام حسن علیہ السلام کے زمانہ کے بعد جن لوگوں نے اقتدار حاصل کیا اُنھوں نے اس خیال سے کہ خلیفہ کا لفظ امیر المومنین کے لفظ سے زیادہ مقدّس[1] ہے اپنے تئیں خلیفہ کے لفظ سے تعبیر کیا۔ جیسے کہ خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس نے اپنے نام کے ساتھ خلیفہ کا لفظ بھی شامل کر لیا تھا۔ مگر یہ امر غور طلب ہے۔ کہ خلیفہ یا امیر المومنین کا ہونا قریش کی نسل کے لوگوں پر منحصر ہے یا نہیں +

اس باب میں مختلف روایتیں ہیں۔ مستدرک حاکم میں اور اُس کی دوسری کتاب میں جو کُنیتوں کے بیان میں ہے۔ حضرت انس سے ایک روایت لکھی ہے اس میں ہے۔ اَلْاُمَرَاءُ[2] مِنْ قُرَیْشٍ اور مستدرک حاکم۔ اور سنن بیہقی میں حضرت علی مرتضےٰ کی روایت سے لکھا ہے۔ اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ مسند امام احمد حنبل اور بخاری۔ اور صحیح مسلم میں ابن عمر سے جو روایت ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ لَایَزَالُ ھٰذَا الْاَمْرُ فِیْ قُرَیْشٍ۔ اور معجم طبرانی اور مسند امام احمد حنبل میں ذی مجمر کی روایت میں ہے۔ کَانَ[3] ھٰذَا الْاَمْرُ فِیْ حِمْیَرَ فَنَزَعَہُ اللّٰہُ مِنْھُمْ وَجَعَلَہٗ فِیْ قُرَیْشٍ۔

[1] مقدس۔ پاک (احمد یابا مخدومی) [2] سردار قریش سے ہیں + [3] یہ کام حمیر میں تھا۔ خدا نے ان سے چھین لیا۔ اور قریش ... [illegible]

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہذا الامر سے قوم کی سرداری یا حکومت مراد ہے۔ کیونکہ حمیر کی قوم سے خلافت رسول اللہ تو کسی طرح متصور ہو نہیں سکتی۔ پس صاف ظاہر ہے۔ کہ ہذا الامر سے قوم کی سرداری اور حکومت مراد ہے۔ نہ خلافت مصطلحہ +

اور مسند امام حنبل اور مسند ابی یعلیٰ۔ اور صحیح ابن حبان اور جامع ترمذی میں سفینہ سے روایت ہے۔ الخلافة[1] بعدی۔ فی اُمّتی ثلاثون سنة ثم ملک بعد ذلک +

سنن ابوداؤد اور مستدرک حاکم میں سفینہ ہی سے روایت ہے۔ خلافت النبوة ثلاثون سنةً ثُمَّ یوتی اللہ الملک من یّشاءُ۔ اور معجم طبرانی۔ اور شعب الایمان بیہقی۔ اور کتاب المعرفۃ ابونعیم میں معاذ اور ابوعبیدہ بن الجراح سے روایت ہے کہ ”ان ھذا الامر بدأ رحمةً ونبوةً ثم یکون رحمة وخلافة ثم کائن ملکاً عضوضاً ثم کائن عتواً وجبریة وفساداً فی الارض +

یہ تمام روایتیں جو ہم نے بیان کیں منتخب کنز العمال فی سنن الافعال والاقوال میں مندرج ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ تمام روایتیں مجروح و مقدوح ہیں۔ اور لائق اعتبار نہیں۔ مگر ہم اس آرٹیکل میں اس امر پر بحث نہیں کرتے۔ بلکہ انہیں روایتوں کو قابل قبول تسلیم کر کے کہتے ہیں۔ کہ ہرگاہ خلافت کا اختتام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تیس برس بعد مذکور ہو چکا ہے۔ اور وہ تیس برس خلع خلافت حضرت امام حسن علیہ السّلام پر ختم ہوتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ اُن کے بعد جو لوگ صاحب حکومت و سلطنت ہوئے ہم اُن کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ مُصطلحہ قرار دیں۔ خواہ وہ قرشی ہوں۔ خواہ غیر قرشی +

پس خلافت کا زمانہ ہونے کے بعد جو لوگ صاحب حکومت ہوئے وہ لوگ بادشاہ یا سلطان یا والی ملک یا امیر وغیرہ قرار پا سکتے ہیں اور جو مذہبی تعلق ہم مسلمانوں کو ان خلفا سے تھا۔ جو زمانہ تیس برس بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں ہوئے۔ وہ اُن حاکموں سے نہیں ہو سکتا۔ جو بعد تیس برس مذکور کے ہوئے۔ خواہ وہ اپنا نام خلیفہ رکھیں۔ یا سلطان یا امیر یا جو کچھ چاہیں۔ پس کسی مسلمان حاکم کو جو کسی ملک میں حکومت رکھتا ہو بجز ایک مسلمان حاکم کے اور کچھ نہیں خیال کر سکتے۔ نہ اس کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ خلیفہ رسول اللہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ ہاں بیشک اسلامی اتحاد اُس کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اس کی بھلائی و بہتری سے خوش اور اُس کی بُرائی و ذلت سے غمگین ہوتے ہیں۔ سلطان ٹرکی کی اُس فتح

(یکم مئی ۱۸۹۷ء)

[1] خلافت میرے پیچھے میری امت میں تیس برس ہے۔ اس کے بعد بادشاہ ہوں گے +[2] بضم اوّل وفتح ثانی

سے جو اس وقت یونانیوں پر حاصل ہوئی ہے۔ بہ سبب اس اتحاد قومی کے جو اسلام نے مسلمانوں پر قائم کیا ہے۔ مسلمان نہایت خوش ہیں۔ اور خدا کا شکر کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ترکوں کی شکست ہوتی۔ تو ہم کو اُسی اتحاد کے سبب ضرور رنج ہوتا۔ اور یہ ایک امر انسان کا طبعی ہے۔ جس سے انکار نہیں ہو سکتا +

یونانی ہمارے حاکم نہیں ہیں۔ ہم اُن کی رعیت نہیں ہیں پس ہم کو یہ کہنے میں کہ خوب ہؤا یونانیوں نے شکست پائی اور ذلیل ہوئے اور خدا کا شکر ہے کہ ترکوں نے فتح پائی۔ کیا تامل ہے +

ہم کو ہرگز نہیں معلوم ہے۔ کہ گورنمنٹ انگریزی کی جس کے امن میں بطور رعیت ہم مسلمان رہتے ہیں۔ اس لڑائی میں جو ترکوں اور یونانیوں سے ہوئی۔ کیا پالیسی ہے۔ اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہے۔ ہم کو اس پر یقین نہیں۔ اور کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ لوگ وہ بات کہتے ہیں کہ ان کو درحقیقت معلوم نہیں۔ اور اگر بالفرض انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہو۔ تب بھی از روے مذہب کے جو ہمارا فرض اپنے حاکموں کی اطاعت اور فرمانبرداری کا ہے۔ اُس سے ہم کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اور ایسی حالت میں بھی ہمارا فرض ہے کہ اپنی گورنمنٹ کے مطیع فرمانبردار اور وفادار رہیں۔ بہت سے بہت اگر کچھ کر سکتے ہیں۔ تو یہ ہے کہ خدا سے دعا کیا کریں۔ کہ برٹش گورنمنٹ اور مسلمانوں کی سلطنتوں میں خواہ وہ ٹرکی کی ہو۔ یا ایران یا افغانستان کی یا اور کسی دُور دراز ملک کی۔ دوستی اور ارتباط رہے۔ اور کبھی مخالفت پیدا نہ ہو +

امام اور امامت

اس مقام پر امام کے لفظ سے ہماری مراد اس شخص سے نہیں ہے جو سب کے آگے کھڑا ہو کر لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے۔ بلکہ ایسے شخص سے مراد ہے۔ جو بہ سبب کمال نفسی و روحانی یا علمی و عملی کے امام کے لفظ سے مخاطب کیا جاتا ہے +

رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں علاوہ نبوت اور نفاذ احکام اور محافظت مسلمین کے جو آنحضرت کے بعد شان خلافت سے متعلق ہیں۔ ذاتی کمالات اور اعلے درجہ کی صفات بھی تھیں پس اُن صفات کمال میں مشابہت پیدا کرنا۔ اس کمال میں امامت کے درجہ پر پہنچنا ہے +

مثلاً رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو علم دین میں محققاً بذریعہ وحی یا الہام کے جو مقتضائے فطرت نبوت تھا۔ اعلے درجہ کا کمال حاصل تھا۔ اور گو اس درجہ کا کمال کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر جن لوگوں نے علم دین اور احکام شریعت کے سمجھنے اور نکالنے میں نہ بطور تقلید بلکہ بطور اجتہاد کوشش کی اور اس کو حاصل کیا۔ اور جم غفیر مسلمانوں نے اس کو قبول و تسلیم کیا۔ گو کہ اس میں خطا کا احتمال بھی ہو انھوں نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے کمال دینی میں ایک قسم کی مشابہت پیدا کی۔ اور اس کمال میں درجۂ امامت حاصل کیا۔ اور تمام لوگوں نے اس فن میں ان کو تسلیم کیا۔ جیسے کہ مجتہدین اربعہ امام۔ ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ۔ امام احمد حنبلؒ۔ امام مالک رضی اللہ تعالے عنہم اجمعین تھے +

یا مثلاً جو تقدس ذاتی اور صفات روحانی اور علم دینی و روحانی رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ اس کو ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے حاصل کیا خواہ تعلیماً خواہ وحیاً اور اس کمال میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشابہت پیدا کی۔ اس لئے جم غفیر مسلمانوں نے ان کو اس کمال میں امام تسلیم کیا اور ائمہ اہل بیت سے ملقب ہوئے +

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو علم عقائد تحقیقاً یا از روے وحی یا الہام کے حاصل تھا جو دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس اس میں مشابہت کا حاصل کرنا صرف استدلال پر منحصر تھا۔ پھر جس نے استدلال سے اس کو حاصل کیا۔ گو کہ اس میں غلطی کا بھی احتمال ہو اور جم غفیر مسلمانوں نے اس کو تسلیم کیا۔ اُس نے اس فن میں امام کا درجہ پایا۔ جیسا کہ

امام غزالی اور امام فخر الدین رازی و دیگر علمائے علم کلام اس فن میں منصبِ امامت کو پہنچے تھے ۔

علاوہ اس کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میں اور بہت سے کمالات ذاتی تھے جیسے تقدس روحانی ۔ استغراق فی ذات اللہ ۔ توجہ الی اللہ ۔ تعمیل حکم ۔ بلاغ ۔ علم ۔ رحمت ۔ شفقت علے المسلمین وغیرہ وغیرہ ۔ پس جو شخص کمالاتِ مصطفوی کے کسی کمال سے اپنے تئیں مشابہ کرتا ہے وہی اس کمال کا امام ہوتا ہے ۔ خواہ وہ امام کے نام سے مشہور ہوا ہو یا نہیں ۔

اور جس نے جو تمام روحانی اور اخلاقی صفات محمدی علے صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مشابہت پیدا کی ہو اور ملک بھی اس کی حکومت میں ہو جس میں اس کو احکام شرعی کے نفاذ اور مسلمانوں کی ہدایت اور حفاظت کا اختیار حاصل ہو ۔ بلاشبہ وہ شخص بھی اس ملک کے لئے جو اس کی حکومت میں ہے ۔ خلیفہ رسول اللہ اور امام کے لقب سے ملقب ہونے کا مستحق ہے اور اگر اُس نے اپنے تئیں اُن صفات کمال کے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں تھیں مشابہ نہیں کیا ۔ اور کسی ملک کی حکومت حاصل کی جیسا کہ بنی اُمیّہ و بنی عبّاس نے تو وہ درحقیقت اُس ملک کے لئے اور اس ملک کے مسلمان رہنے والوں کے لئے سلطان ہے نہ امام ۔ اور نہ خلیفہ رسول اللہ ۔ گو کہ اس نے فخریہ طور پر خلیفہ کا لقب اختیار کیا ہو اور بزور حکومت اپنے تئیں خلیفہ کہوایا ہو ۔ اسی لئے اس نے اپنے اجتہاد سے جو احکام متعلق مذہب کے دیئے ہوں وہ وقعت سے نہیں دیکھے جاتے ۔

اور اگر اس نے اپنے تئیں صفات کمال رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے مشابہ کیا ہے اور کوئی ملک اُس کی حکومت اور قبضۂ اقتدار میں نہیں ہے جس میں وہ احکام شرعی کو نافذ اور وہاں کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے تو وہ صرف انہی امور میں جن میں اُس نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے مشابہت پیدا کی ہے امام ہے مگر اس پر خلیفہ رسول اللہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا ۔ اور اسی وجہ سے ائمہ اہل بیت علیہم السلام امام کے لفظ سے ملقب ہوئے ہیں ۔

مگر فرق اسلامیہ میں امام کا مرتبہ قرار دینے میں اختلاف ہے ۔ شیعہ تو امام کو معصوم اور منصوب من اللہ اور مفروض الطاعت قرار دیتے ہیں ۔ اور یہ کرامت حضرت امام مہدی علیہ السلام پر جو ائمہ اہل بیت کے اخیر امام ہیں ختم ہو گئی ۔ وہ پیدا ہوئے تھے اور سُرّ من رائے کی غار میں غائب ہو گئے ہیں ۔ مگر اب تک زندہ ہیں ۔ اور امام العہد والزمان ہیں اور قیامت کے قریب ظاہر ہونگے ۔ اور اس لئے کوئی دوسرا شخص امام نہیں ہو سکتا ۔

مگر اہل سنت و جماعت کسی امام کو منصوب من اللہ اور معصوم عن الخطا قرار نہیں دیتے بلکہ وہ سوائے پیغمبر کے کسی کو گو کہ وہ کیسا ہی مقدس ۔ ذی علم اور صاحب فضل و کمال ہو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے ۔

نتیجہ اس اختلاف کا یہ ہے کہ شیعہ تو امام کے حکم تمام دنیا کے شیعہ مسلمانوں پر بیچون و چرا واجب التعمیل سمجھتے ہیں ۔ مگر چونکہ اُن کے امام دنیا کی آنکھوں سے غائب ہیں اس لئے اس زمانہ میں کوئی ایسا حکم اُن کے لئے وجود پذیر نہیں ہو سکتا جس کی اطاعت تمام دنیا کے شیعہ مسلمانوں پر واجب ہو ۔

اہل سنت و جماعت کسی امام موجودہ یا گذشتہ کا حکم تمام دنیا کے سُنی مسلمانوں پر بیچون و چرا واجب التعمیل نہیں سمجھتے ۔ جو لوگ بے پڑھے یا کم استعداد ہیں ۔ وہ تو جس امام کے معتقد ہیں یا جس کے اُن کے باپ دادا معتقد تھے ۔ اسی کی پیروی کرتے ہیں ۔ اور جو لوگ ذی استعداد اور قابل ہیں وہ جب تک اس بات کو نہ سمجھ لیں کہ وہ حکم امام کا صحیح اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق ہے اس کو واجب التعمیل نہیں جانتے ۔ اور اسی سبب سے اہل سنت و جماعت میں تقلید اور عدم تقلید امام معین پر بحث چلی آتی ہے ۔ اس میں کچھ شک نہیں ۔ کہ قرون مشھود لھا بالخیر میں اور اس کے بعد تک بھی یعنی جب تک فقہ کی کتابیں مرتب ہوئیں ۔ کوئی شخص کسی کی تقلید پر مجبور نہیں تھا ۔ اگر کوئی مسئلہ کسی کو معلوم نہیں تھا تو وہ کسی عالم سے جس سے اس کا جی چاہتا تھا ۔ پوچھ لیتا تھا ۔

غرضیکہ سنیوں میں بعد پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا کہ مذہبی امور میں اس کا حکم تمام دنیا کے مسلمانوں پر واجب التسلیم ہو ۔ خود صحابہ متعدد مسائل مذہبی میں مختلف الرائے تھے ۔ اور ایک دوسرے کی رائے کو واجب التسلیم نہیں سمجھتا تھا ۔ مثلاً اکثر صحابہ معراج جسمانی کے قائل تھے ۔ مگر حضرت عائشہ کو معراج جسمانی سے انکار تھا ۔ حضرت عبداللہ بن عمر سماع موتےٰ کے قائل تھے ۔ مگر بعض صحابہ اس کے سخت مخالف تھے ۔ حضرت ابو ہریرہ کا عقیدہ تھا کہ عزیزوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب نازل ہوتا ہے ۔ حضرت عائشہ اس کے مخالف تھیں ۔ یہ اختلاف صحابہ میں عقائد کا تھا ۔ اسی طرح وہ فقہی مسائل میں بھی باہم مختلف تھے ۔ حضرت عبداللہ بن عباس اس بات کے قائل تھے کہ وضو میں اعضاء کو ایک ایک بار دھونا چاہئے ۔ مگر حضرت ابو ہریرہ کے نزدیک دو دو بار دھونا لازم تھا ۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہؓ تو فجر کی نماز میں

صحابہ مسائل میں مختلف الرائے تھے ۔

فقہی مسائل میں اختلاف رائے تھا ۔

وعا قنوت پڑھنے کو لازمی قرار دیتے تھے۔ مگر حضرت ابو مالک اشجعی کو اس سے انکار تھا۔ اکثر صحابہ مسح علی الخفین[۵] کو جائز سمجھتے تھے۔ مگر حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اور بہت سے مسائل ہیں۔ جن میں صحابہ اور تابعین آپس میں مختلف الرائے تھے۔ اور ایک دوسرے کی رائے کو تسلیم نہیں کرتا تھا +

موجودہ زمانہ کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو امام کا رتبہ رکھتا ہو۔ اور نہ کوئی شخص گو کہ وہ کسی ملک کا حاکم بھی ہو۔ ایسا ہے جو خلیفہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہلانے کا مستحق ہو۔ البتہ جو مسلمان کسی ملک حکومت رکھتے ہیں وہ اس ملک کا سلطان کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور در حقیقت وہ اُس ملک کے سلطان بھی ہیں گو اُنہوں نے اپنے تئیں کسی لقب سے ملقب کیا ہو +

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اسلام کی رُو سے رعیت کو اپنے سلطان کے ساتھ کس طرح پیش آنا لازم ہے۔ اس کا بیان مشکوۃ کی ایک حدیث میں ہے جس کو ہم بعینہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں +

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال۔ اِنَّ السُّلْطَانَ ظِلُّ اللهِ فِی الْاَرْضِ یَاوِیْ الیہ کلُّ مظلومٍ من عبادہ۔ فاذا عدل کان لہ الْاَجْرُ وعلی الرَّعِیَّۃِ الشکر۔ واذا جار۔ کان عَلَیْہِ الْاِصْرُ وعلی الرَّعِیَّۃِ الصَّبْرُ +

یعنی ابن عمر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا نقل کیا ہے کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے کہ ہر مظلوم اس کے بندوں میں سے اس کی پناہ میں آتا ہے۔ پھر اگر اُس نے عدل کیا تو اس کی بھلائی اُس کے لئے ہے اور رعیت پر اس کا شکر کرنا فرض ہے۔ اور اگر وہ ظلم کرے تو اس کی بُرائی اس پر ہے۔ اور رعیت کو اس پر صبر کرنا لازم ہے +

اس حدیث میں سلطان کا لفظ بغیر کسی قید کے آیا ہے پس وہ سلطان خواہ مسلمان ہو خواہ یہودی ہو۔ خواہ عیسائی ہو۔ خواہ آتش پرست۔ خواہ بُت پرست۔ اُس کے ساتھ اس کی رعیت کو اسی طرح پیش آنا لازم ہے کہ جس طرح کہ اس حدیث میں بیان ہوا ہے +

اس حدیث میں سلطان کو ظلُّ اللہ اس لئے کہا ہے کہ جس طرح ہر مظلوم خدا کی پناہ ڈھونڈتا ہے اسی طرح اس کی رعیت کا ہر مظلوم کسی مذہب کا ہو سلطان کی پناہ میں آتا ہے۔ اور اسی مشابہت سے سلطان کو ظلُّ اللہ کہا ہے +

اب ہم کو ہندوستان کے مسلمانوں پر غور کرنی ہے۔ جو بطور رعیت کے اور مستامن ہو کر انگلش گورنمنٹ کے ماتحت رہتے ہیں۔ انگلش گورنمنٹ نے اُن کے ساتھ عدل

[۵] جرابوں پر مسح کرنا (احمد مخدومی)

وانصاف کرنے میں بقدر اپنی طاقت کے کوئی وقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اُن کے تمام معاملات کے فیصلہ کے لئے قانون بنا دیئے ہیں۔ اور ہر شخص پہلے سے جانتا ہے کہ کسی فعل کا نتیجہ وہ ہے جو قانون میں لکھا ہے +

مذہبی آزادی انگلش گورنمنٹ نے ہر ایک قوم کو دی ہے۔ تمام مذہب والوں کے مذہبی معاملات ان لے مذہبی مسائل کے موافق عدالت سے فیصل ہوتے ہیں۔ جان اور مال کا امن اور سوائے بغاوت اور شرارت کے ہر قسم کی آزادی انگلش گورنمنٹ کی رعیّت کو حاصل ہے پس بالتخصیص مسلمانوں کو مطابق اُس حدیث کے جو اوپر مذکور ہوئی انگلش گورنمنٹ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور انگلش گورنمنٹ کی رعایا ہو کر وہ انگلش گورنمنٹ کے ساتھ کسی قسم کا فساد یا مخالفت یا بغاوت قولاً و فعلاً نہیں کر سکتے +

اور حدیث کی کتابوں میں متعدد حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں۔ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نہایت تاکید سے نصیحت کی ہے اور فرمایا ہے کہ تم اپنے امیروں اور حاکموں کی ہر حالت میں اطاعت کرو۔ خواہ تمہارے ساتھ ظلم و ستم ہوتا ہو۔ یا وہ انصاف و مروت سے پیش آتے ہوں۔ اُن حدیثوں میں حاکم یا امیر کے ساتھ کوئی شرط یا قید نہیں ہے۔ جس سے یہ بات معلوم ہو کہ حاکم یا امیر کس مذہب کا ہو۔ پس تمام مسلمانوں کو ان حدیثوں کا ماننا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ اور اُنہی حدیثوں کی رُو سے لازم آتا ہے کہ تمام مسلمان جو ہندوستان میں جو برٹش گورنمنٹ کے سایۂ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں۔ اور خدا کا شکر کریں کہ اُس نے ایسی مہربان اور عادل گورنمنٹ اُن کی جان و مال اور عزت اور مذہب پر مسلط کی ہے۔ جو اُن کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرتی ہے۔ اور اس نے ہر طرح کی مذہبی آزادی عنایت کی ہے۔ اور وہ کوئی ایسا حکم نہیں دیتی ہے نہ کبھی دیگی جس سے ہم کو خدا کی نافرمانی کرنی پڑے۔ اور اس قول پر عمل کرنے کی ضرورت پیش آئے کہ[1] لا سمعٌ وَلا طاعةَ فی معصیۃِ اللہِ +

---

[1] سنینگے نہ مانینگے (اس بات کو جس کے کرنے سے) خدا کی نافرمانی ہوتی ہو + (احمد مخدومی)

سرسید احمد و کانگریس

(یہ تحریر ایک رسالے سے ملی ہے۔ اسے سیاسی و امور تدابیر ملکی سے تعلق ہے۔ اس جگہ مناسب جان کر درج کی جاتی ہے سلا احمد بابا مخدومی)

ماخوذ از پاینیر

بخدمت ایڈیٹر پاینیر

سر

میرے ایک دوست نے مجھ کو ایک پرچہ اخبار دکن بجٹ مورخہ ۱۵ تاریخ کا بھیجا ہے جس میں مفصلہ عبارت درج ہے:۔

"اخبار ہندو اس بیان کے لئے ذمہ وار ہے کہ سرسید احمد نے اپنی پالیسی بدل دی اور اب سائمل ٹینیس امتحانات کے (یعنی ہندوستان میں بھی سول سروس کا امتحان ہوا کرے) حامی ہوگئے ہیں۔ اور جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ اور بھی خلاف شان علیگڈھ کے ٹائٹ کے ہے کہ اُن کے بیٹے مسٹر جسٹس سید محمود سے اور چیف جسٹس اور ہائی کورٹ الہ آباد کے دیگر ججوں سے تکرار سی ہوگئی ہے اور اپنی دو برس کی رخصت کے اختتام پر مجبوری ریٹائر کئے جائیں گے۔ اس لئے سرسید اب کل طبقۂ حکام اور اُن کے کاموں کے دشمن ہوگئے ہیں۔"

میں نے ہندو اخبار جس کی طرف دکن بجٹ نے اشارہ کیا ہے نہیں دیکھا۔ اور دکن بجٹ پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا کہ اس بے بنیاد افواہ کی موکد تکذیب کرتا۔ میرے بعض دوستوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں موکد اور علانیہ انکار ایسی افواہوں کا کروں کیونکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ افواہیں میرے بہت سے ہموطنوں اور ہم مذہبوں کو دھوکا دینگی جو کہ اگرچہ مجھ سے ذاتی واقفیت نہیں رکھتے لیکن پبلک معاملات کے متعلق میری آرائے اور پالسی کے منتظر رہتے ہیں اور ان کی زیادہ تر وقعت کرتے ہیں بہ نسبت ایک معمولی شخص کی آرائے کے۔ جیسیکہ میں ہوں۔ انھوں نے مجھ کو صلاح دی ہے۔ کہ میں آپ کے باوقعت اخبار کے کالم میں ان بے بنیاد افواہوں کی تردید کروں اور نیز اپنی آرائے مختصر طور پر بیان کروں +

اس سے بہت پہلے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا خیال بھی ہوا ہو۔ میں نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزینٹیٹو گورنمنٹ ہندوستان کے مناسب حال ہے؟ اور جان اسٹوارٹ مل کی آرائے بتائید ریپریزینٹیٹو گورنمنٹ کے (جو آرائے غالباً نہایت عمدہ توضیح سے بیان کی گئی ہیں) پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ اول لازمی امر ایسے طریقۂ حکومت کے لئے جس کا انتظام صرف کثرت رائے پر چلتا ہو یہ ہے کہ ووٹرز (رائے دینے والوں) میں ہم جنسیت ہو۔ بلحاظ قوم کے۔ اور مذہب کے۔ اور عادات معاشرت کے۔ اور رسومات کے۔ اور تمدنی حالات کے۔ اور بلحاظ تاریخی ملکی روایات کے۔ یعنی ریپریزینٹیٹو طریقہ سے رائے دینے میں یہ مسلّم امر ہے کہ رائے دینے والوں اور ملک کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت امور بالا میں ہو۔ اور جب یہ باتیں موجود ہوں تو یہ طریقۂ حکومت عمل میں آسکتا ہے یا مفید ہو سکتا ہے۔ جہاں یہ امور موجود نہ ہوں یا اُن کا خیال نہ کیا جائے۔ تو ایسے ملک میں جیساکہ ہندوستان ہے کہ جہاں کہیں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں۔ سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اور میں دل سے امید کرتا ہوں کہ خواہ کنسرویٹو یا لبرل یا یونینسٹ یا سیپریٹسٹ بلحاظ آئرلینڈ کے۔ یا زیادہ سے زیادہ ریڈیکل کو بھی جب پارلیمنٹ میں قوت حاصل ہو تو وہ اس امر کو نہ بھلا دینگے کہ ہندوستان براعظم ہے اور مثل انگلستان یا اسکاٹ لینڈ یا ویلز یا آئرلینڈ کے ایک چھوٹا سا ملک نہیں ہے۔ اور اس میں وسیع مختلف آبادیاں ہیں جن کی تمدنی اور اخلاقی اور سوشل اور پولیٹکل اور مذہبی اور طبعی اور تاریخی حالات بہت مختلف ہیں۔ اور جن میں اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد سے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اور بجائے اس کے کہ کوئی اور طریقۂ حکومت اسلامی طریقہ کے بدلے قائم کرتے۔ ہمیشہ آپس میں لڑتے رہے۔ اور لوٹ مار اور خونریزی اور طوائف الملوکی کو قائم رکھا۔ اور جو طریقہ ختم نہیں ہوا جب تک کہ سابق ایسٹ انڈیا کمپنی کا شائستہ کرنے والا اور منتظم ہاتھ یہاں نہ پہنچا جو کمپنی جماعت انگریزی حاکموں کی تھی۔ اور واقعات کی مدد سے اور انصاف اور مذہبی آزادی کی وجہ سے وہ اس قابل ہوئے کہ امن اور انتظام قائم کیا۔ اور مختلف صوبوں کو متحد کر کر ایک سلطنت قائم کی۔ جو کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جیسیکہ حقیقت میں سلطنت تھی ظاہر ابھی سلطنت کہلانے لگی جب کہ بموجب شرائط برٹش کانسٹیٹیوشن ملکہ معظمہ

نے خود اپنے ہاتھ میں عنان حکومت لی۔ اور ۱۸۵۸ء کے مشہور اشتہار کے ذریعہ سے مشتہر کیا۔ میں اُن آدمیوں میں سے نہیں ہوں۔ جو کہ ہندوستان کے طریقۂ حکومت میں جو یہ تبدیلی واقع ہوئی اس کو یونہی برائے نام خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ جو کوئی ہندوستان کی اس زمانہ کی تاریخ سے واقف ہے۔ جانتا ہے کہ سوداگروں کی جماعت کے ہاتھ سے خواہ وہ کتنے ہی خلائق دوست اور اشراف اور کارکن کیوں نہ ہوں۔ مالک تخت و تاج کے ہاتھ میں حکومت چلے جانے سے ایک حقیقی اور عظیم تبدیلی واقع ہوئی اور اس وجہ سے میں نے یہ کبھی خیال نہیں کیا کہ ملکہ معظمہ کا "قیصرۂ ہند" کا خطاب یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو اختیار کرنا ایک بے معنی رسم یا بچوں کا کھیل تھا۔ یہ امر چند شرائط کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ انتظام حکومت کی جزئیات میں ترقی ہوسکتی ہے۔ لیکن اس پر بحث کرنیکا یہ موقع نہیں ہے لیکن اس کے خلاف نہیں کہا جاسکتا کہ سلطنت جمہوری کی کامیابی کیلئے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ اُس آبادی میں ہم جنسیت ہو۔ اور جتنے وہ زیادہ تر مشابہ ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ جمہوری حکومت میں ضروری اور خیال کر لیا جاتا ہے۔ کہ افراد ایسے ہی مشابہ ہیں جیسے دو مٹر کے دانے۔ میں آئرلینڈ کے ملکی معاملات کے لئے سند نہیں ہوں۔ لیکن جو ذرائع مجھ کو بہم پہنچ سکتے ہیں۔ جب کہ میں اس ملک سے اتنے فاصلہ پر ہوں اور مختلف قوم اور ملت کا شخص ہوں۔ میں یہ کہنے کی جُرأت کرتا ہوں کہ میری رائے عاجز میں قریباً جتنی مشکلات اور مصائب آئرلینڈ میں واقع ہوئیں۔ وہ ان پولٹیکل واقعات کی وجہ سے ہوئیں۔ یعنی آئرلینڈ مفتوح ملک ہے اور آئرش مفتوح قوم ہے۔ جن کو انگلش نے فتح کیا۔ اور وہاں جو کہ انگلش رہتے ہیں خصوصاً وہ بڑے بڑے مالکان اراضی جن کو وہاں کا زمیندار اور تعلقہ دار کہا جاسکتا ہے۔ وہ انگلش نسل کے ہیں۔ اور حکمران قوم ہیں۔ اور اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا خواہ خلائق دوستی کے راست نما فقروں اور موجودہ زمانہ کی تہذیب کے چکنے چکنے الفاظ سے کتنا ہی کیوں نہ چھپایا جائے۔ آئرلینڈ میں انگلش انگلش ہیں اور اس لئے حکمران قوم ہیں۔ اور آئرش آئرش ہیں اور مفتوح قوم۔ اور نیز حکمران انگلش پراٹسٹنٹ مذہب کے ہیں۔ اور آئرش رومن کیتھولک۔ اور اس لئے ایک دوسرے کی طرف سے آپس میں تلخ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر انگلش حکومت آئرلینڈ اس عرصہ دراز تک قائم رہی تو اس کی وجہ صرف وہ ہجنسیت اور میل جول ہے جو رنگ کی اور مذہب کی مشابہت سے باہمی معاکحت اور تمدنی حالات اور عادات کا ایک سا ہونا اور باہمی سلوک ہے۔ جس پر جمہوری سلطنت بے خطرہ

قائم ہوسکتی ہے۔ لیکن باایںہمہ انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد مبنی ہیں تاریخی واقعات زمانہ گذشتہ وحال کے بُھلا دینے پر۔ اور ہندوستان کی مختلف اقوام کا لحاظ نہ کرنے پر۔ اور یہ فرض کرلیتے ہیں کہ مسلمان اور مرہٹہ۔ برہمن اور چھتری۔ بنیا اور شودر۔ سکھ اور بنگالی۔ مدراسی اور پشاوری سب سے ایک قوم کی طرح برتاؤ کیا جاسکتا ہے۔ اور سب ایک ہی قوم سے ہیں۔ اور اُن کا مذہب اُن کی زبان اُن کی عادات اور مراسم اور ملکی اور تاریخی روایات بالکل ایک ہیں۔ اور اُن سے اس طرح بحیثیت مجموعی برتاؤ کیا جاسکتا ہے۔ گویا وہ انسانوں کا ایک گلّہ ہیں۔ میں اس خیال کو وہم سے کم نہیں سمجھتا کہ جمہوری طریقہ کل اقوام اور مذاہب اور ممالک اور ازمنہ کے لئے یکساں موزون ہے۔ میری رائے میں یہ طریقہ عقلاً بھی ناکمل ہے۔ کیونکہ یہ ضروری بات ہے کہ ایسے طریقہ میں کثرت رائے سے انتظام ہو۔ اور اس لئے یہ مان لیا جاتا ہے کہ انسان کی میجارٹی[1] اس قابل ہیں کہ یہ فیصلہ کرسکیں کہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ نارضامند مینارٹی[2] پر بھی کیونکر حکومت کی جائے۔ حالانکہ حقیقی امر یہ ہے جیسا کہ مسٹر کارلائل مرحوم نے جن سے مجھے ذاتی واقفیت رکھنے کی عزت حاصل تھی۔ کہیں کہا ہے۔ کہ کثرت انسان عقلمندی سے بہت دور ہیں۔ یہ خیال فیاض نہ ہو مگر بدقسمتی سے ٹھیک ہے +

تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود یونان اور روما کی قدیم جمہوری سلطنتوں کی شان و شوکت کے۔ اور باوجود اُن عظیم فتوحات کے۔ جو مسلمانوں کو نیم جمہوری سلطنت میں پہلے خلفاء کے عہد خلافت میں حاصل ہوئیں۔ لیکن زمانۂ حال میں سوائے اینگلوسیکسن یا برٹش اقوام کے جن میں یونائیٹڈ اسٹیٹ امریکہ[3] اور آسٹریلیا و نیوزیلینڈ کی کالونیاں[4] شامل ہیں کسی اور قوم کو جمہوری سلطنت میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لاطینی اقوام میں فرنچ اور اٹیلین اور اسپنیش کے زمانہ حال میں جمہوری حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ اور کم ترقی یافتہ اقوام مثل روس وغیرہ نے کوشش بھی نہیں کی۔ سوائے اُس بدنظمی کے جو سوشلسٹ اور نائہلسٹ فرقوں نے امن میں خلل ڈالنے سے پیدا کی۔ ایشیا میں ترکوں نے آخری جنگ مابین ترک وروس کی مصائب کے بعد ضعیف اور انقلابی کوشش کی۔ کہ پارلیمنٹ قائم کریں۔ لیکن کامل ناکامیابی ہوئی۔ خاص ایشیا میں ایک ذہین اور ہشیار اور محنتی اور تجارتی اور ایک لحاظ سے مہذب ملک جیسا کہ چین ہے۔ اور جہاں بلحاظ رنگ[5] مذہب

---

[1] کثرت + [2] قلت + [3] اضلاع متحدہ افریقہ + [4] کولونیا (نئی بستی) نوآبادی۔ [5] سمترہ

اور قوم کے زیادہ ہمجنسیت ہے۔ بہ نسبت ہندوستان کے اُس نے ابھی تک اس کی کوشش نہیں کی۔ اور اگر جاپان جس کو بوجہ جزیرہ ہونے کے اور یونائیٹڈ اسٹیٹ امریکہ کے عمدہ اثر کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ اب اس کا تجربہ کر رہا ہے۔ تو یہ کوشش زیادہ تر بندر کی نقلوں کی ہے اور حقیقی پیروی انگلینڈ اور امریکہ کی نہیں ہے۔ اور ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس کا نتیجہ اُس ملک کی قسمت پر کیا ہوگا۔ کل دنیا کے ممالک میں سے ہندوستان جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے لئے موزون ہے۔ اور میں اُس تجربہ کو جو انڈین نیشنل کانگریس کی کوشش کرنا چاہتی ہے۔ ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں۔ جو شک اور مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ کل اقوام ہند کے لئے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے۔ کیونکہ اگرچہ مسلمان میناریٹی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی متحد میناریٹی ہیں۔ اور کم سے کم روایتاً اس بات کے عادی ہیں کہ جب مجاریٹی ظلم کرے تو تلوار ہاتھ میں لیں۔ جو طریقہ ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے بھی زیادہ تر مضر ہوگا مسلمانوں کی آئندہ بہبودی اور ترقی کے لئے۔ بحیثیت ملکۂ معظمۂ انگلستان اور قیصرہ ہند کی با امن اور تابع اور وفادار رعایا ہونے کے۔ میں بوجہ ہوتے برٹش سبجکٹ[1] اور وفادار سٹیزن[2] کے۔ اور اپنے ہموطنوں کا عموماً اور اپنے ہم مذہب مسلمانوں کا خصوصاً سچا خیر خواہ ہونے کے۔ بہت زیادہ اور سخت مخالف ہوں۔ کل ایسی جمہوری تحریکوں کا جو برٹش رول[3] کے خلاف شکایتیں اور رنجشیں بھڑکاتی ہیں۔ اور اس ملک میں جہاں مختلف اقوام اور مذاہب آباد ہیں اس کی اعلےٰ قوت اور اختیار کو تزلزل میں ڈالتی ہیں۔ یہ امر کہ مجھ کو اس رائے پر کہ جمہوری سلطنت کے لئے لازم ہے کہ اُن باتوں میں ہم جنسیت ہو جن کا ذکر میں نے اوپر کیا۔ کس قدر پورا اور واثق یقین ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چند سال گذرے کہ جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڈھ کی گورننگ[4] باڈی کے انتظام کے قواعد بنائے جاتے تھے۔ جہاں رہنے کا طریقہ مثل آکسفورڈ[5] اور کیمبرج[6] کے کالجوں کے ہے۔ اور اس وجہ سے کل ہندوستان کے مختلف اضلاع کے لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ تو میں نے اس امر کی بہت احتیاط اور کوشش کی۔ کہ کالج کے ٹرسٹیز[7] جن کے ہاتھ میں کل انتظام ہوگا۔ اور جن کی کثرت رائے پر کالج کی آئندہ حالت منحصر ہوگی۔ وہ سب مسلمان ہوں۔ اگرچہ بہت سے کالج کے اور میرے ذاتی ایسے یورپین اور ہندو دوست ہیں۔ جو بوجہ کالج کے ساتھ ہمدردی

۱؎ رعیت برطانیہ + ۲؎ شہری۔ باشندۂ شہر + ۳؎ حکومت برطانیہ + ۴؎ جماعت منتظمہ +

۵؎ ۶؎ انگلستان میں دو شہر ہیں اور یونیورسٹیاں + (احمد بابا مخدومی)

۷؎ رفیقان + (احمد مخدومی)

رکھنے اور اس کی طرف فیاضی کرنے سے اور ہر طرح پر اس قابل تھے کہ کالج کی منتظم جماعت کے رکن ہوں۔ اور وہ دوست جانتے ہیں۔ کہ یہ قاعدہ اگرچہ مذہب اور قوم کے اعتبار سے سخت ہے لیکن کسی ایسی وجہ سے نہیں بنایا گیا جو تعصب اور تنگدلی سے منسوب ہو۔ بلکہ اُن ہی خیالات کی وجہ سے بنایا گیا ہے۔ جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اور اسی وجہ سے چند سال ہوئے۔ جب کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اوّل اوّل شور و غل کیا کہ میں نے اپنی پبلک اسپیچوں میں اپنے ہموطنوں اور ہم مذہبوں کو یہ صلاح دی کہ اُس کانگریس کی خطرناک اور اس لئے غیر وفادار اور گمراہ کرنے والی اور دھوکا دینے والی تحریک سے بالکل الگ رہیں۔ اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ کانگریس کی رپورٹوں میں اپنے مسلمان ممبروں کو بہت کچھ بڑھایا جاتا ہے۔ لیکن اگر غور سے امتحان کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ ایک بھی بڑا معزز شخص مسلمانوں میں سے اُس میں شریک نہیں ہوا۔ اور مسلمان اُمراء اور اشراف عموماً کانگریس کے غل و شور میں شریک نہیں ہوئے۔ اور کانگریس معقول طور پر اپنے اس دعوے کو صحیح ثابت نہیں کر سکتی۔ کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات اور آراے اور خواہشوں اور امیدوں کو ظاہر کرتی ہے۔

یہ تجویز کہ سول سروس کا امتحان ہندوستان میں بھی ہوا کرے۔ کانگریس کے غل و شور کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کانگریس کسی قوم کے خیالات ظاہر کرتی ہو۔ لیکن مسلمانوں کے ہرگز نہیں کرتی۔ اور جہاں تک میری آراے تعلق رکھتی ہیں اور اگر وہ اس لائق ہیں کہ آپ کے کالم میں ممتاز ہوں۔ تو صرف اس وجہ سے ہے کہ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں میرے دوست خیال کرتے ہیں کہ سال تینیس امتحانات کے متعلق میری خاموشی غلط فہمی پیدا کریگی۔ مخصوصاً اُن لوگوں کے دلوں میں جو میری آراے جاننے کے خواہشمند ہیں۔ اور میری تصانیف اور اسپیچیں پڑھنے کے شائق ہیں۔ لیکن مجھ سے ذاتی واقفیت نہیں رکھتے۔ اور یہ امر کہ جو مجھ سے یا میرے خیالات سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایسے امور میں میری کیا رائے ہے۔ اور غلطی میں نہیں پڑ سکتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۹ اگست کو بعد ختم ہونے اس جلسہ کے جو مسلمانوں نے مدراس میں سول سروس امتحان ہندوستان میں ہونے کے خلاف کیا تھا۔ وہاں کے ایک مسلمان جنٹلمین محمد یٰسین صاحب بی۔ اے نے مجھ کو یہ تار بھیجا +

بہت کامیاب جلسہ خلاف سال تینیس امتحانات کے گذشتہ ہفتہ کو ہوا۔ وزلین ہکل پر ہزاروں موجود تھے۔ پروگرام اور میموریل روانہ ہوتا ہے۔ مبارکباد قبول کیجئے +

میں نے ۳۰ تاریخ کو یہ جواب بھیجا:-

آپ کو اور مسلمانان مدراس کو کامیاب جلسہ پر مبارکباد +

اس لئے "ہندو" اخبار کو جو غالباً مدراس کا کوئی انگریزی کا اخبار ہے ایسی افواہوں کے مشتہر کرنے کے لیئے کوئی عذر نہیں تھا۔ اور اس افواہ کو دکن بجٹ نے منقول کیا ہے۔ اور میں نے دکن بجٹ کے اس فقرہ کو اس خط کے شروع میں نقل کر دیا ہے۔ ایسی افواہ نہ صرف میرے پولیٹیکل خیالات کو غلط ظاہر کرتی ہیں۔ بلکہ میری ذاتی شہرت اور خصلت کے لئے مضر ہیں۔ اور میرے ایسے دوستوں کو جو اپنی ہدایت کے لئے پبلک پالسی کے متعلق میری آرائے کے منتظر رہتے ہیں۔ تکلیف پہنچانے والی اور پریشان کرنے والی ہیں۔ کیونکہ ان افواہوں نے میرے اُن پبلک خیالات کو جو برٹش رول کے ساتھ تمام زندگی کی وفاداری اور محبت کی وجہ سے اور اپنے ہموطنوں اور ہم مذہبوں کی بہبودی کی وجہ سے ہیں ایک ایسے واقعہ کے ساتھ ملا دیئے ہیں جیسے کہ وہ نااتفاقی ہے۔ جو سر جان ایج چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ اور میرے بیٹے سید محمود کے بیچ میں ہو گئی ہے۔ پبلک اس سے بالکل ناآگاہ ہیں کہ اس قابل افسوس غلط فہمی کے اتفاقات اور پیچیدگیاں اصل میں کیا ہیں۔ اور میری رائے میں نہ اُن کو کوئی حق ہے کہ اس بات کی توقع رکھیں۔ کہ سید محمود یا میں پبلک کے اشتیاق کو رفع کرنے کے لئے کوئی عام اظہار بذریعہ اسپیچ یا مضمون کے کرونگا۔ لیکن میں اُن لوگوں کو جو میری آرائے اور خیالات کی وقعت کرتے ہیں۔ یہ یقین دلاتا ہوں کہ نہ میری اور نہ میرے بیٹے کی وفاداری اور محبت کے خیالات جو کہ برٹش رول کے ساتھ ہیں ایک ایسے ہیچ واقعہ سے بدل سکتے ہیں جیسا کہ دو شخصوں میں جو ایک ہی گورنمنٹ کی خدمت کرتے ہیں۔ اختلاف رائے کا ہونا۔ جہاں تک مجھ سے علاقہ ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ جو میری آرائے اور خیالات برٹش گورنمنٹ کی نسبت ہیں اُن کے اصول میرے بیٹے سید محمود کی پیدائش سے بہت پہلے قائم ہو چکے تھے۔ میرے پدری اجداد نے سلطنت مغلیہ کی خدمات خصوصاً صیغۂ فوج میں ذمہ داری کے معزز عہدوں پر وفاداری اور محبت سے کیں۔ اور میں اپنے خاندان کا پہلا شخص ہوں۔ کہ سبارڈنیٹ جوڈیشل عہدہ پر برٹش سروس میں داخل ہوا۔ برٹش رول کے ساتھ میری وفاداری اور محبت کی آزمائش ۱۸۵۷ء کے مصائب میں ہوئی تھی۔ اور اس امر کے یہاں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

میرا بیٹا سید محمود میرے خاندان میں اپنے جدی سلسلہ میں پہلا شخص ہے جس کو انگریزی زبان اور ادب ۱۸۵۷ء کے بعد سکھایا گیا۔ اُس کی تعلیم کسی گورنمنٹ سروس کے لئے نہیں ہوئی۔ اور اگرچہ باعتبار عمر اور تعلیمی صفات کے اُس کو لندن کے مقابلہ کے امتحان میں کامیابی کا ایک سے زیادہ موقع مل سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے

قدرتی میلان اور خوشی سے بار کو گورنمنٹ سروس پر ترجیح دی۔ جب تک کہ وہ ۱۸۷۹ء میں اودھ میں ڈسٹرکٹ جج مقرر کیا گیا اور پھر آخر کار الہ آباد ہائی کورٹ کا پیونی جج۔ اب بوجہ اُس قابل افسوس غلط فہمی کے جو اُس میں اور سرجان ایج میں واقع ہوگئی ہے جو کچھ حالات اُن کے عہدہ کے زمانہ اور اُس پر جاری رہنے کے ہوں۔ مگر اس قابل افسوس امر سے برٹش کے ساتھ میری وفاداری کے خیالات پر جو تمام عمر میرے دل میں موجود رہے ہیں ذرا سا بھی کسی قسم کا اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور میں اس رُول کو ہمیشہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ وہ میرے ہموطنوں اور ہم مذہبوں کے امن اور بہبودی کے لئے ایک بڑی برکت ہے۔ اور اس سے یہ نکلتا ہے جو کہ اب میں بہت زور سے لکھتا ہوں کہ اُن لوگوں کو جو میری ذاتی خصلت اور پبلک پالسی کی وقعت کرتے ہیں۔ اُن کو یقین رکھنا چاہئے کہ میری آرائے پر جو انڈین نیشنل کانگریس کی تجاویز اور مقاصد اور خواہشوں اور نیز اس کے نتیجہ یعنی ہندوستان میں سول سروس امتحان ہونے کے خلاف ہیں۔ اُن آرائے پر مطلقاً کسی قسم کا اثر نہیں پڑا اور نہ بدلیں۔ میں آپ کا بہت ممنون ہونگا۔ اگر آپ براہ مہربانی اس خط کو اپنے کالم میں جگہ دینگے۔ کیونکہ پھر کثیر خطوں کے جواب دینے کی ضرورت نہیں رہیگی۔ اور نہ کسی دوسرے اخبار میں اس امر پر لکھنے کی ضرورت باقی رہیگی۔ جیسا کہ پہلے آپ کے اخبار میں اُن امور کے صاف بیان کرنے سے جن کی وجہ سے میں نے لیجسلیٹو کونسل سے استعفا دیا تھا جھوٹی افواہ اور غلط فہمیاں پھیلنے سے رُک گئی تھیں۔ جو اُس وقت غالباً میرے استعفا دینے سے پھیل جاتیں +

آپ کا خادم

(دستخط) سید احمد

علیگڈھ ۲۲۔ ستمبر ۱۸۹۳ء

عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہمی مودّت اور اتحاد

مسلمانوں اور عیسائیوں میں گو اختلاف مذہب ہے مگر اگلے زمانہ میں باہمی عداوت کا ہونا تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں تو خود یہ آیت موجود ہے:۔ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ "یعنی اے پیغمبر تو مسلمانوں کے ساتھ محبت کرنے میں اُن کو سب سے زیادہ قریب پاویگا۔ جو کہتے ہیں۔ کہ ہم نصارے ہیں۔ اس لئے کہ اُن میں عالم اور درویش ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے (مائدہ۔ ۸۵)۔

سرولیم میور اپنی کتاب میں جو خلفاء راشدین کے حال میں لکھی ہے۔ لکھتے ہیں۔ کہ خود رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے مسیحی قبائل سے عہدنامے کئے تھے۔ جن میں آپ نے عیسائیوں کی حفاظت کا اور ان کو ان کے مذہب میں آزاد رہنے کا اور پادریوں کے پرانے حقوق اور اختیارات کے بحال رہنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ علاوہ اس کے عیسائی بھی مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح سے معاشرت اور معاونت میں شریک رہتے تھے۔

۱۳ھ ہجری میں جب جسر کے مقام پر لڑائی ہوئی جس میں مسلمانوں کا سپہ سالار مثنےٰ بن حارثہ تھا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو کچھ دقّت پیش آئی۔ تو اس وقت قبیلہ بنی طے کا ایک عیسائی سردار مسلمان سپہ سالار کے پاس آیا اور دریا کے پل کی حفاظت کی تاکہ عرب بسہولت اس پل سے اُتر جائیں۔ اور جب کہ دوبارہ فوج کشی ہوئی تو بنی نمر کے قبیلہ کا ایک عیسائی سردار جو رومیوں کی حد میں رہتا تھا۔ کمک کے طور پر لشکر اسلام میں آکر شامل ہوا۔ اور اسی سنہ میں جب یوہب کی لڑائی ہوئی۔ تو اسی قبیلہ بنی نمر کا عیسائی سردار دشمنوں پر دھاوا کرنے میں مسلمانوں کا شریک ہوا۔ اور مسلمانوں کے سردار اور اُس عیسائی سردار نے شامل ہو کر دھاوا کیا اور اسلام کی فتح ہوئی۔ میور صاحب اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔ کہ اس معرکہ میں جو شجاعت کے کام ہوئے۔ ان سب میں بڑھ کر ایک مسیحی نوجوان کا کام تھا جو اپنی بدوؤں کی ایک قلیل جماعت لے کر اسلام کے لشکر میں اس وقت داخل ہوا۔ جب کہ خوب گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ اور وہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر مخالفوں سے لڑا اور اپنے گھوڑے کو دوڑا کر دشمنوں میں گھس گیا۔ اور مخالف لشکر کے سردار کو قتل کیا۔ اور پھر اپنے گھوڑے کو دوڑا کر مسلمانوں کے لشکر میں پکارتا ہوا داخل ہوا۔ کہ میں بنی تغلب میں سے ہوں۔ اور میں وہ ہوں جس نے

دشمن کے سردار کو قتل کیا +

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنو تغلب کی نسبت جو عیسائی تھے حکم دیا کہ اُن پر کسی طرح کا دباؤ ڈالا جاتے۔ اور وہ اپنے مذہب کی پیروی میں بالکل آزاد رہیں۔ جزیہ جو عیسائیوں سے لیا جاتا تھا بنی تغلب اس کا ادا کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے درخواست کی کہ اُن سے بھی اس طرح پر محصول لیا جاوے۔ جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے اور حضرت عمرؓ نے ان کی درخواست منظور کی +

سر ہنری لیرڈ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ گرکے قریب جو بحیرۂ لوط کے مشرق میں ہے۔ ان کا گذر ایک خیمہ گاہ میں ہوا جو عیسائی عربوں کا تھا۔ اور یہ عیسائی عرب لباس اور آداب معاشرت میں مسلمان عربوں سے کسی بات کا فرق نہ رکھتے تھے۔ مسٹر پر خارت جو ایک نہایت نامی عیسائی سیاح ہیں۔ لکھتے ہیں۔ کہ بلپاترا کے قریب بارہ سو آدمی رہتے ہیں جن میں سے نصف عیسائی ہیں جو اپنے مسلمان ہمسائیوں کے ساتھ نہایت درجہ کے ملاپ سے رہتے ہیں۔ اور مسلمان بدوؤں کا لباس پہنتے ہیں۔ کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں کوئی ظاہرا تمیز نہیں ہوسکتی۔ بنو غسان جو عیسائی ہیں۔ وہ اب تک اپنی عبادات میں عربی زبان کا استعمال کرتے ہیں +

ہرقلؔ[1] کی جب شکست ہوئی۔ اور اس کی فوج شہر حمص کے قریب آئی تو شہر والوں نے جو عیسائی تھے فصیل کے دروازے بند کر لئے اور مسلمانوں سے کہا کہ ہم تمہاری حکومت اور تمہارے انصاف کو یونانیوں کی بے انصافی اور ظلم کے مقابلہ میں بہتر جانتے ہیں +

یہ تو اگلے زمانے کا حال ہے۔ مگر ہم اس زمانہ میں دیکھتے ہیں کہ جو عیسائی مسلمانی سلطنتوں میں رہتے ہیں۔ ان کے اور ان کے ہمسایہ مسلمانوں میں کسی قسم کی مذہبی عداوت نہیں ہے۔ آپس میں سوشیل[2] برتاؤ نہایت خوبی سے ہے +

عیسائیوں اور مسلمانوں۔ میں مذہبی عداوت ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ مذہب کی رُو سے مسلمانوں کو عیسائیوں کے ساتھ ہر قسم کی معاشرت کی کھانے پینے میں ہو یا شادی بیاہ میں۔ سوائے چند جزئی اور خفیف باتوں کے عام طور پر اجازت ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں سوائے چند متعصب اور ناعاقبت اندیش بادشاہوں مثل متوکل باللہ وغیرہ کے ایسے بادشاہوں کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں جنہوں نے عیسائیوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا۔ اُن کے مذہبی رسوم اور مذہبی حقوق میں دست اندازی نہیں کی۔ اور ٹھیک اُسی طرح برتاؤ کیا۔ جس طرح رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کے زمانہ میں ہوا تھا +

[1] ہرقل بکسر ہا و کسر قاف۔ نام ہے رومی بادشاہ کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا ۔ [2] معاشری۔ تمدنی (محمودی)

مذہب اسلام نہایت وسیع مذہب ہے جس میں تحمل اور ادب کا حکم ہے۔ تمام پیغمبر خواہ ان کو یہودی مانتے ہوں یا عیسائی اُن سب کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اُن کی تعظیم کرتا ہے۔ اور اُن مذہب کے لوگوں کے ساتھ ٹالریشن[ا] کا حکم دیتا ہے۔ بلکہ جب وہ بلند آواز سے پکارتا ہے کہ کوئی ملک اور قوم ایسی نہیں ہے جس میں خدا کے کسی پیغمبر نے اُس کی حجت کو پورا نہ کیا ہو۔ تو کون شخص شبہ کرسکتا ہے۔ کہ عیسائیوں کے ساتھ کسی موقع پر بھی مسلمانوں کو سختی کرنے کا صراحتہً یا اشارتاً حکم دیا گیا ہے۔ اور کون شخص ہے جو بعض ظالم مسلمان حکمرانوں کے بیجا متعصبانہ سختیوں کے لئے مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے جواز کا فتویٰ نکال سکتا ہے۔ بلکہ میں پھر کہتا ہوں کہ مذہب اسلام خاص کر عیسائیوں کے ساتھ اور عیسائیوں کے پیغمبر اور بزرگوں کے ساتھ تحمل اور ادب و تعظیم کی تعلیم دیتا ہے +

سوائے مذہب اسلام کے دنیا میں اور کونسا مذہب ہے۔ جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور ان کی ہدایات کا ایسا ادب کیا ہو۔ اور ایسی عزت کی ہو جیسی کہ مسلمان کرتے تھے۔ اور کرتے ہیں۔ اور اُن کو نبی برحق اور رسول خدا کا مانتا ہو۔ اور یہ سمجھتا ہو۔ کہ ہم میں اور عیسائی مذہب میں جو کلمۃ الحق ہے وہ ایک ہی ہے۔ اور اس میں کچھ فرق نہیں کہ خود خدا نے قرآن مجید میں فرمایا ہے ” یَا اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ“ یعنی اے عیسائیو ایک بات پر آجاؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنے کے۔ پس دنیا میں سوائے اسلام کے اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہے۔ جو حضرت عیسیٰؑ کو رسول برحق اور مرسل من اللہ مانتا ہو مسلمانوں نے مذہب کی بنا پر جو کچھ عیسائیوں سے چاہا ہے۔ وہ صرف یہی بات ہے کہ ہم اور تم دونو ملکر ایک خدا کی عبادت کریں +

خود عیسائی مذہب میں مختلف فرقے ہیں۔ جو مسئلہ تثلیث اور اقانیم ثلاثہ کی نسبت اس امر میں مختلف الرائے والاعتقاد ہیں۔ کہ ان اقنوموں کا ظہور کس طرح سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات مبارک میں ہوا تھا مسلمان بھی یقین کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ ہیں۔ خود قرآن مجید میں خدا نے فرمایا ہے ” اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ اَلْقٰھَا اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ“ یعنی حضرت عیسیٰ خدا کا کلمہ ہے جو مریم میں ڈالا گیا۔ اور اس کی روح ہے۔ بایں ہمہ مسلمان مثل یونیٹیرین[۲] کے جو ایک فرقہ عیسائیوں کا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ پر یقین کرتے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ کو بندہ اور خدا کا رسول جانتے ہیں پس جو اختلاف کہ مسلمانوں کی مذہب کی راہ سے ہے۔ وہ ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ خود عیسائی فرقے

[ا] تحمل۔ بردباری [۲] عیسائیوں کا ایک مُوحّد فرقہ ہے۔ جو مسیح نبی مانتا ہے (مخدومی)

اس میں مختلف ہیں +

نہایت نالائق ہیں۔ وہ عیسائی جو مذہب اسلام اور بانی اسلام کی نسبت نعوذ باللہ کلمات توہین استعمال کرتے ہیں۔ اور نہایت نالائق ہیں وہ مسلمان جو حضرت عیسٰے علیہ السلام کی نسبت یا اُن کے اصلی مذہب کی نسبت ایسے ہی کلمات استعمال میں لاتے ہیں +

مذہب کی رُو سے اور اُس برتاؤ سے جو اس وقت بھی مسلمان عیسائیوں سے کرتے ہیں۔ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی مذہبی عداوت نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ عیسائی مسلمانوں کے ساتھ یا مسلمان ازروئے مذہب کے عیسائیوں کے ساتھ مذہبی عداوت رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک محض غلط اور سزا پانا واجب ہے۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں لڑائیاں ہوئیں اور مخالفتیں بھی پیدا ہوئیں۔ اور عداوتیں بھی ہوئیں۔ مگر ان کی بنا پولیٹیکل امور پر مبنی تھی۔ پولیٹیکل امور پر لڑائی جھگڑوں۔ فسادوں اور عداوتوں کا ہونا کچھ غیر مذہب یا غیر قوم پر منحصر نہیں ہے بلکہ پولیٹیکل امور ایسے ہوتے ہیں۔ کہ آپس میں ایک قوم اور ایک مذہب کے لوگوں میں لڑائیاں اور عداوتیں ظہور میں آتی ہیں سینکڑوں لڑائیاں آپس میں مسلمانوں کی انہیں پولیٹیکل امور کے سبب سے ہوئی ہیں۔ اسی طرح باہم عیسائیوں کے اور آپس میں ایک ہی قوم کے انہیں پولیٹیکل امور کے سبب سے بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ مگر جب یہ لڑائیاں ایسے لوگوں میں واقع ہوتی ہیں۔ جن کا مذہب بھی مختلف ہوتا ہے۔ تو ان میں مذہبی جوش کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عیسائیوں نے جنگ صلیبی میں جو ایک پولیٹیکل یا قومی لڑائی تھی۔ مذہب عیسوی کے جوش کو بھی شامل کر لیا تھا۔ جو صلیبی جہاد کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی جب دوسرے مذہب والوں سے لڑائی کی تو مذہبی جوش کو اس میں شامل کر لیا +

۱۸۵۶ء میں ترکوں اور روسیوں سے لڑائی ہوئی۔ تو انگریز اور فرانس سلطان ترکی کے طرفدار ہوئے اور برابر نہایت بہادری اور عمدگی سے سلطان ترکی کے طرفدار ہو کر روسیوں سے لڑے۔ پس یہ تمام کارروائی بجز پولیٹیکل امور کے کسی دوسرے امر پر مبنی تصور نہیں ہو سکتی +

۱۸۷۶ء میں جب دوبارہ ترکوں اور روسیوں سے لڑائی ہوئی۔ اس وقت فرانس کو وہ شان و شوکت جو زمانہ بادشاہت میں تھی نہیں رہی تھی۔ اور ریپبلک[1]

[1] جمہوری سلطنت ۱۲

کو قائم ہوئے بہت تھوڑا زمانہ گذرا تھا۔ اس میں اتنی طاقت نہ تھی۔ کہ روسیوں کے مقابلہ میں ترکوں کی مدد کرے۔ انگریزوں نے بھی کسی مصلحت ملکی سے تنہا بلا شمول کسی دوسری سلطنت کے ترکوں کی مدد کرنا اور ان کے ساتھ شامل ہو کر روسیوں سے لڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور صرف ترک روسیوں سے لڑتے رہے۔ اخیر کو انگریز اور اور سلطنتیں بیچ بچاؤ کرنے کو پڑیں جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ بہت سے ملک سلطان کے قبضہ سے نکل گئے۔ مگر یہ تمام کارروائی پولٹیکل امور پر مبنی تھی نہ مذہبی عداوت پر۔

حال کے زمانہ میں جو آرمینیا والوں نے بغاوت اور شرارت کی اور یونانیوں نے سر اُٹھایا جس کی سزا وہ پا رہے ہیں اور خدا نے چاہا تو اپنے کئے کی اور سزا پاوینگے۔ اس فساد کو مذہبی عداوت پر مبنی کرنا محض غلطی اور سراپا دھوکا ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ بھی پولٹیکل امور پر مبنی ہے۔ جس کے سبب سے آرمینیا والوں نے بغاوت کی۔ اور یونانی جنگ پر آمادہ ہوئے۔ ہاں ان فسادات کے ساتھ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ آرمینیا والوں اور ان کے مغویوں نے اور یونانی اور اُن کے طرف داروں نے مذہبی جوش کو بھی شامل کرلیا۔ جو محض ایک جھوٹا بہانہ ہے۔ اگر ہم تسلیم کریں کہ سلطان کی عملداری میں انتظام نہایت خراب ہے۔ اور آرمینیا والوں نے اُس خراب انتظام کے سبب سے بغاوت کی ہے۔ تب بھی یہ بات تسلیم کرنی پڑیگی۔ کہ یہ فساد مذہبی عداوت کے سبب سے نہیں ہؤا۔ بلکہ بدانتظامی کے سبب سے ہؤا۔ اور یہ کہنا کہ سلطان کی عملداری میں عیسائیوں پر ظلم ہوتا ہے۔ ایسا جھوٹ ہے جس سے بڑھکر کوئی نہیں ہوسکتا عیسائی سلطان ترکی کی عملداری میں نہایت مذہبی آزادی سے رہتے ہیں۔ اور جتنی رعایتیں اُن کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ مذہبی آزادی جو ترکوں کی عملداری میں عیسائیوں کو حاصل ہے کسی عملداری میں عیسائیوں کو حاصل نہیں۔ سلطان ان کے مذہبی مراسم میں مطلق دست اندازی نہیں کرتا۔ بلکہ اُن کی خواہش پر ان کے لئے بشپ یعنی سردار مذہب مقرر کرتا ہے اور جو اعزاز کے درجے سلطنت ترکی میں ہیں۔ وہ سب اُن کو عطا فرماتا ہے۔ خود عیسائی سلطنتوں میں اُن عیسائیوں کو جو اس چرچ کے نہیں ہیں۔ جس چرچ کی سلطنتیں ہیں ایسی مذہبی آزادی نہیں ہے۔ جیسی کہ سلطان کی عملداری میں تمام عیسائیوں کو خواہ کسی چرچ کے ہوں حاصل ہے اس وقت جو لڑائی یونان اور ترکی میں ہو رہی ہے۔ تمام عیسائی سلطنتیں خاموش ہیں۔ اور کسی سلطنت نے یونان کی مدد نہیں کی ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ آخر کو عیسائی سلطنتوں کو جو ترکی کے اردگرد ہیں بیچ بچاؤ کرنے اور صلح کے ہوجانے

میں بالاتفاق دست اندازی کرنی پڑے اور معلوم نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو۔ ٹرکی کے مفید یا لونانیوں کے مفید۔ مگر اس سب کی بنا پولٹیکل امور پر مبنی ہوگی نہ مذہبی امور پر۔ پس نہایت افسوس ہے کہ مسلمان یا عیسائی ان ملکی فسادوں کو مذہبی لباس پہنا کر لوگوں کو مشتعل اور برانگیختہ کریں۔ جس سے سراسر ان لوگوں کا نقصان ہے جو ایسی باتوں سے مشتعل ہوں۔ اور ملکی امور کو مذہبی لباس پہنا کر مذہب پکاریں۔ اور ایسا کرنے سے بجز اس کے کہ اُن کی حماقت ثابت ہو اور ہونا کیا ہے؟ بجز اس کے کہ اُن کی حماقت سے انہیں کے اہل مذہب کا کچھ نہ کچھ نقصان ہو اور کچھ نتیجہ نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ٹرکی ایک مسلمانی سلطنت ہے اگر اس کو واجبی خواہ ناواجبی کچھ نقصان پہنچے تو یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ہم مسلمانوں کو نہایت دلی رنج ہوگا۔ اور یہ بات ٹرکی ہی پر موقوف نہیں ہے اگر ایران کی سلطنت کو۔ مراکو کی سلطنت کو۔ افغانوں کی سلطنت کو انہیں کی نادانی اور حماقت اور بدنظمی سے کچھ پہنچے تو بھی ہم مسلمانوں کو قدرتی رنج ہوگا۔ اور یہی حال تمام قوموں کا ہے کہ اپنی اپنی قومی سلطنت کے زوال یا نقصان سے رنج ہوتا ہے۔ بس اس سے زیادہ ان واقعات کو وقعت دینا اور مذہبی لباس پہنانا محض بیجا اور ناواجب ہے۔ مسلمانوں میں ایک مدت دراز سے بلحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہوگیا ہے۔ بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہوگیا ہے۔ اور "کل مؤمن اخ" کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے۔ اس لئے وہ ہر ملک کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں۔ اور اُس کی خوشی سے خوش اور اُس کے رنج سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور اس لئے ہم کو اگر خدانخواستہ ترکوں کو نقصان پہنچے۔ تو مثل قومی نقصان کے رنج ہوگا۔ گو وہ نقصان کسی پولیٹیکل سبب سے ہی ہو ٭

یونانی اور ترک

یونانیوں پر ترکی کی فتح کی خوشی میں مسلمانوں نے حد اعتدال سے باہر قدم رکھا ہے۔ ترکوں کی اس فتح کو اسلام کی فتح سے پکارتے ہیں۔ ہماری دانست میں ایسے امور میں اسلام کو شامل کرنا۔ اور اسلام اسلام پکارنا۔ نہایت ناسمجھی کی بات ہے۔ اسلام کی فتح آج نہیں ہوئی۔ بلکہ اُس دن ہوئی۔ جب کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ہزاروں کافروں اور مشرکوں اور بُت پرستوں میں کھڑے ہو کر فرمایا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ کافر کہتے ہی رہے۔ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ یعنی کیا اُس نے بہت سے خداؤں کے بدلے ایک ہی خدا ٹھیرایا ہے یہ تو ایک عجیب بات ہے۔ مگر رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ خدا نے بھی یہی کہا۔ اَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ یعنی میری ہی عبادت کرو یہی سیدھا رستہ ہے۔ پس کسی مسلمان بادشاہ کی فتحیابی کو اسلام کی فتح۔ اسلام کی فتح سے پکارنا اسلام کی قدر و منزلت کو نا سمجھنا ہے۔ فتح اور شکست خدا کی دین ہے۔ جس کو چاہے دے۔ خود خدا فرماتا ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ یعنی ہم ان دنوں کو لوگوں میں اَدلتے بَدلتے رہتے ہیں کبھی مسلمانوں کی غیر مذہب والوں پر فتح ہوتی ہے۔ کبھی غیر مذہب والوں کی مسلمانوں پر۔ جب کہ ترکوں نے انگریزوں اور فراسیسوں[۱] کی مدد سے روسیوں پر فتح پائی تھی۔ تو ہم اس فتح کو کس نام سے پکاریں۔ اور جب ترکوں کی روسیوں سے شکست ہوئی۔ تو کیا ہم اس شکست کو اسلام کی شکست سے (نعوذ باللہ) موسوم کریں۔ حاشا و کلا ہمارا مقصد یہ ہے۔ کہ ایسی چیزوں کے ساتھ جو دنیاوی امور اور دنیاوی اسباب پر منحصر ہیں۔ کبھی اِدھر ہوتے ہیں۔ کبھی اُدھر۔ اسلام کے معزز نام کو جس نے اصلی فتح پائی ہے اور جو ہمیشہ فتحمند رہیگا۔ شامل کرنا کمال ناسمجھی کی بات ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہئے کہ ایک مسلمان سلطنت اس جنگ میں فتحیاب ہوئی اور برباد نہیں ہوئی لیکن اس کو ایک اسلامی لباس پہنانا۔ اور اسلام کی فتح اسلام کی فتح پکارنا۔ اگر حد سے باہر قدم رکھنا نہیں ہے۔ تو اور کیا ہے۔ اور یہ فتح ایسی کونسی فتح ہے۔ جس پر اتنا شور غل

[۱] اخباروں میں کبھی کبھی بعض لوگ فراسیس کی بجائے فرانسیسی لکھنے لگے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ انشا کہتے ہیں
پگڑی تو نہیں ہے یہ فراسیس کی ٹوپی * یہاں وقت سلام اُترے ہے ابلیس کی ٹوپی (احمد مخدومی)

مچایا جاوے۔ ہر شخص جانتا تھا۔ کہ ترکوں کے آگے یونانیوں کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اگر وہ مقابلہ کرینگے۔ تو جس طرح ایک باز چڑیا کو مار لیتا ہے۔ اسی طرح ترک یونانیوں کو مار لینگے اندیشہ اگر تھا تو یہ تھا۔ کہ یونانیوں کو ترکوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت کیوں ہوئی۔ اور اس لئے خیال جاتا تھا۔ کہ درپردہ کوئی بڑی قوی سلطنت یونانیوں کی مدد پر ہے۔ اُس شبہ کو مسٹر گلیڈسٹون کی نامعقول سپیچوں اور تحریروں نے۔ اور لندن کے ریڈیکل مجنونوں کی اسپیچوں اور ٹیلیگراموں نے زیادہ قوی کر دیا تھا۔ مگر ہر سمجھدار سمجھ سکتا تھا۔ کہ نہ مسٹر گلیڈسٹون گورنمنٹ پر ہیں۔ نہ اُن قلیل ریڈیکل ممبران پارلیمنٹ کا گورنمنٹ پر کچھ اثر پڑ سکتا ہے۔ پس یہ خیال کر لینا کہ گورنمنٹ انگریزی کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہے۔ نہایت غلطی اور سفاہت پر مبنی تھی۔ جب لڑائی کا معرکہ گرم ہوا۔ تو کسی بڑی سلطنت نے یونانیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ اور اس سے ظاہر ہو گیا۔ کہ نہ گورنمنٹ انگریزی یونانیوں کی مددگار تھی۔ نہ فرانس۔ نہ جرمن۔ نہ کوئی اور گورنمنٹ۔ اب آیندہ جو کچھ ہو۔ اُس کی بنا پولٹیکل مصلحتوں پر ہوگی۔ نہ اسلام کی مخالفت پر۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جو اس معاملہ میں اس قدر جوش و خروش ہوا۔ ہماری دانست میں صرف انگریزی اخبار اُس کا باعث ہوئے ہیں۔ مسٹر گلیڈسٹون نے اور انگریزی اخباروں نے کوئی درجہ اہانت اور سخت کلامی کا سلطان کی نسبت نہیں چھوڑا تھا اور کوئی بدی اور بُرائی ایسی نہ تھی۔ جو انہوں نے ترکوں کی نسبت نہ لگائی ہو۔ اور یہ سب باتیں خاصکر ترکوں اور عام طور پر سب مسلمانوں کو رنج دہ اور سخت رنج دہ تھیں۔ مگر جب ترکوں کی فتح ہوئی۔ تو انہوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا رحم برتا کہ اُس سے زیادہ نہیں ہو سکتا مثلاً جب یونانیوں کے ایک گروہ کے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہا۔ تو ترکوں نے اپنے پاس سے اُن کو کھانے کو دیا۔ یونانیوں کے مجروحوں کی تیمارداری کی۔ اور نہایت مہربانی سے اُن کے ساتھ برتاؤ کیا۔ اب ترکوں کی فتح ہونے کے بعد اُس رنج کے مقابلہ میں مسلمانانِ ہند نے اُس فتح کی خوشی میں حد اعتدال سے زیادہ خوشی ظاہر کی۔ اور گورنمنٹ انگریزی نہایت خاموشی سے ان سب باتوں کو دیکھتی رہی۔ ہم بھی اس خوشی کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے۔ مگر یہ تبلاتے ہیں۔ کہ ہم مسلمان ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کی رعایا ہیں۔ اور اس بات کو کبھی بھولنا نہیں چاہئے۔ کہ ہم غیر سلطنتوں کے ساتھ پولٹیکل امور میں کوئی کام اور کوئی فعل ایسا نہیں کر سکتے۔ جو گورنمنٹ کے برخلاف ہو۔ پس ہم کو لازم ہے۔ کہ ہم وہی کریں۔ جو گورنمنٹ کی مرضی کے برخلاف نہ ہو ✦

سلطان اور ہندوستان کے مسلمان

اس عنوان کے نیچے اخبار پایونیر میں ایک تار قسطنطنیہ کا مورخہ ۷ اجون چھپا ہے۔ جس کا مضمون یہ ہے :-

"جو جواب سلطان نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مبارکبادیوں کا ارسال فرمایا ہے جو انہوں نے یونان پر ٹرکی کی فتوحات کی نسبت سلطان ممدوح کی خدمت میں بھیجی تھیں۔ وہ ایک طولانی چھٹی میں درج ہے جس میں خلیفہ کی نسبت تمام سچے مسلمانوں کے فرائض بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں نقصانات نقدی اور اخلاقی اور جسمانی شامل ہیں۔ چٹھی مذکور کے خاتمہ پر یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ اسلام کی قوت اتفاق اور یکجہتی پر منحصر ہے۔ یہ چٹھی خاص ایلچیوں کی معرفت ہندوستان اور مصر اور عرب کے شیوخ اور علمار کے پاس بھیجی جاویگی"۔

اس ٹیلیگرام کا ترجمہ ہمارے پچھلے اخبار میں چھپ چکا ہے مگر اس وقت ہم اس ٹیلیگرام کے مضمون پر غور کرتے ہیں کہ وہ صحیح ہے یا اُس میں کچھ غلطی ہے۔ ہمارے نزدیک جہاں تک اُس کا مضمون ہندوستان کے مسلمانوں سے متعلق ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ہمارے نزدیک ممکن ہے کہ سلطان نے اسی مضمون کی کوئی چٹھی مصر او رعرب کے علما اور شیوخ کے پاس بھیجی ہو۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس ایسی چٹھی کا بھیجنا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور بظاہر ٹیلیگرام کا یہ بیان کہ "سلطان نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مبارکبادی کے جواب میں یہ چٹھی لکھی ہے۔ اور یہ چٹھی خاص ایلچیوں کی معرفت ہندوستا کے علما کے پاس بھیجی جاویگی" صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہماری دانست میں بموجب نیشنل لا کے سلطان کو اس قسم کی پولٹیکل تحریر کرنے کا کسی دوسری سلطنت کی رعایا کو بلا توسط وہاں کی گورنمنٹ کے اختیار نہیں ہے۔ اور ہم ہرگز خیال نہیں کر سکتے کہ سلطان ٹرکی کو یہ امر معلوم نہ ہو۔

مسلمانان بمبئی نے جو تار مبارکباد فتح کے بھیجے تھے۔ اس کا جواب بھی سلطان نے براہ راست مسلمانان بمبئی کو نہیں بھیجا تھا۔ بلکہ اپنے انبیسیڈر[1] مقیم بمبئی کے پاس وہ جواب بھیجا تھا۔

ہم نے سنا ہے کہ مسلمانانِ شملہ نے بھی تار مبارکباد فتح کا سلطان کی خدمت میں

[1] سفیر ۱۲

بھیجا تھا۔ مگر جو کہ شملہ میں کوئی ایمبیسڈر سلطان کی طرف سے نہیں ہے۔ اس واسطے سلطان نے اُس کا جواب اپنے ایمبیسڈر مقیم لندن کے پاس بھیجا۔ اور لندن کے ایمبیسڈر نے اُس کا جواب مسلمانان شملہ کے پاس بھیجا۔ ہم کو ٹھیک معلوم نہیں ہے کہ یہ امر صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن قیاساً معلوم ہوتا ہے کہ صحیح ہو گا۔ پس جب کہ سلطان نے ایسی احتیاط ہندوستان کے مسلمانوں کی مبارک باد کے جواب بھیجنے میں کی ہے۔ تو ہم سمجھ نہیں سکتے کہ سلطان نے کوئی ایسی چٹھی براہ راست مسلمانان ہندوستان کے نام لکھی ہو۔ اور اپنے ایلچیوں کی معرفت براہ راست ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس بھیجیں۔ بالفرض اگر سلطان نے ایسا کیا ہو۔ جو ہماری رائے میں ہرگز نہیں کیا ہوگا۔ تو گورنمنٹ انڈیا کو از روئے انٹرنیشنل لا کے اختیار کامل ہے۔ کہ ایسے ایلچی کو ہندوستان میں نہ آنے دے اور جو چٹھی اُس کے پاس ہو اس کو ضبط کر لے ✦

مذکورہ بالا ٹیلیگرام میں لکھا ہے کہ اُس چٹھی میں خلیفہ کی نسبت تمام سچے مسلمانوں کے فرائض بیان کئے گئے ہیں۔ جب کہ ہندوستان کے مسلمان سلطان ٹرکی کی رعایا نہیں ہیں۔ تو ہندوستان کے مسلمانوں کو خلیفہ کی نسبت کیا فرائض بیان ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بجز اس کے کہ وہ جس سلطنت کی حکومت میں بطور رعایا کے رہتے ہیں۔ اُس کے خیر خواہ اور وفادار رہیں۔ اور کچھ فرض نہیں ہے ✦

ایک اور فقرہ اس ٹیلیگرام میں مندرج ہے۔ کہ "جو فرائض مسلمانوں کے بیان کئے گئے ہیں۔ اُن میں نقصانات نقدی اور اخلاقی اور جسمانی بھی شامل ہیں"۔ ہم تو اس فقرہ کا کچھ مطلب ہی نہیں سمجھ سکتے۔ اور اگر کچھ مطلب ہو تو وہ مصر اور عرب کے مسلمانوں سے متعلق ہوگا۔ جو سلطان کی رعیت ہیں۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں سے نہ متعلق ہو سکتا ہے۔ اور نہ اُس کے کچھ معنی سمجھ میں آ سکتے ہیں ✦

ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تہنیت نامے مصر اور عرب سے اس فتح کی بابت سلطان کی خدمت میں آئے ہیں۔ شاید ان کے جواب میں کوئی چٹھی سلطان نے لکھی ہو۔ مگر ٹیلیگرام بھیجنے والے نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے جو مبارکبادی بھیجی ہے۔ اُس کے جواب میں وہ چٹھی ہے ✦

سلطان نے جو یونانیوں پر فتح پائی۔ اُس سے کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جس کا دل خوش نہ ہُوا ہو۔ ہم بھی کہتے ہیں۔ کہ سلطان کی اس فتح سے ہمارا دل بھی نہایت خوش ہوا ہے لیکن جو کچھ ہندوستان کے مسلمانوں نے کیا بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ کے ہم

اُس کو اچھا نہیں سمجھتے۔ گو گورنمنٹ نے اس پر کچھ اعتنا نہیں کیا۔ مگر جن مسلمانوں کو ایسا کرنا تھا ہمارے نزدیک ضرور تھا کہ اوّلاً گورنمنٹ سے اس کی اجازت حاصل کرتے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ان کو کرنا تھا کرتے۔ ہم ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ایسے پولیٹیکل امور میں جو دوسری سلطنتوں سے متعلق ہیں۔ بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ ہندوستان کے مسلمانان ہندوستان کوئی کارروائی کریں۔ کیونکہ ہمارا قانونی اور مذہبی فرض یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اپنی گورنمنٹ کے وفادار اور اس کی مرضی اور پالیسی کے تابع رہیں۔ اور یہ بات تو کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ دکن کے ہندؤں نے کس خیال سے سلطان کو اس فتح کی بابت مبارکبادی بھیجی۔ کیا وہ بھی اُن فرائض میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ جو سلطان مسلمانوں کی نسبت قرار دے ✦

آخر کو ہم پھر بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا ٹیلیگرام یا تو غلط ہے یا اس میں مسلمانان ہندوستان کی نسبت جو کچھ لکھا ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے ✦

جب کہ ترکوں نے سپاسٹپول کی لڑائی میں روسیوں پر فتح پائی تھی۔ اُس وقت مسلمانان ہند نے کوئی علامت ایسی خوشی کی ظاہر نہیں کی تھی جیسے کہ یونانیوں پر فتح پانے پر ظاہر کی ہے ✦

سپاسٹپول کی لڑائی میں خود انگریزی گورنمنٹ میں ترکوں کے لئے ہندوستان میں چندہ جمع کرنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن اگر ہماری یاد میں کچھ غلطی نہ ہو تو اُس وقت بھی ترکوں کے لئے کوئی معتد بہ چندہ ہندوستان میں نہیں ہوا تھا ✦

پس یہ بات غور کرنے کی ہے کہ یونان پر فتح پانے میں ہندوستان کے مسلمانوں نے کیوں ایسی گرمجوشی ظاہر کی ہے ✦

ہماری رائے میں اس کے دو سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ یورپ کے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کوئی بہت بڑا تعلق سلطان ٹرکی سے نہیں ہے پس مسلمانان ہندوستان نے عملی کارروائی سے ظاہر کیا کہ اُن کو سلطان ٹرکی سے جو حرمین شریفین کا محافظ ہے خاص قسم کا تعلق ہے۔ قطع نظر اس سے کہ سلطان مذہبی خلیفہ ہے یا نہیں اور مسلمانوں کو اُس کے احکام کو تسلیم کرنا لازم ہے یا نہیں ✦

دوسرے یہ کہ۔ مسٹر گلیڈسٹون اور دیگر ریڈیکل ممبران پارلیمنٹ نے نہایت سخت اور محض بیجا اور ناواجب زبان درازی سلطان ٹرکی اور ترکوں کی نسبت کی تھی جس سے مسلمانان ہند کے دل نہایت رنجیدہ تھے۔ جبکہ ترکوں کو یونانیوں پر فتح ہوئی۔ تو جس قدر اُس زبان درازی سے مسلمانوں کو رنج ہوا تھا۔ اُسی قدر اُن کو خوشی کرنے کا موقع ملا۔ مگر اس خوشی کو کسی پولیٹیکل امور پر محمول کرنا ہماری رائے میں بیجا ہے۔ اور اس سے زیادہ اور کوئی امر ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا ✦

ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردی

اگر کوئی شخص ہمارے دوست کی جان بچائے یا مصیبت کے وقت اس کے ساتھ ہمدردی کرے تو ہم کو اُس کا شکر کرنا لازم ہے یا نہیں ؟

سب سے بڑا سخت وقت ترکوں پر وہ تھا جب کہ ۱۸۵۵ء میں روس نے ترکوں سے لڑائی شروع کی جو جنگ کریمیا کے نام سے مشہور ہے۔ اُس وقت دو سلطنتیں یعنی انگلستان اور فرانس نے ترکوں کے ساتھ ہمدردی کی۔ اور فوج سے۔ روپیہ سے ترکوں کی مدد کی۔ اور کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ کہ اگر انگلستان اور فرانس اُس زمانہ میں ترکوں کی مدد نہ کرتے تو سلطنت ٹرکی کا یقینی خاتمہ ہوجاتا۔ پس اب سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں کے ساتھ ہمدردی ہے تو کریمیا جنگ کے فتح ہونے کے بعد کس وجہ سے مسلمانوں نے گورنمنٹ انگریزی اور گورنمنٹ فرانس کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اور اُن کے لئے مساجد اور معابد میں کیوں نہیں دُعا کی اور کیوں پیغام تاربرقی شکریہ کے یا ایڈریس شکرگذاری کے انگلش اور فرنچ گورنمنٹ کے پاس نہیں بھیجے۔

ایک انگریز کا قول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بڑے احسان فراموش ہیں۔ کہ جس زمانہ میں انگریزوں نے جان و مال سے ترکوں کی مدد کی تھی۔ اسی کے قریب یعنی ۱۸۵۷ء میں اُنہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے مقابلہ میں غدر کیا۔ اگر درحقیقت ان کو ترکوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی تو اس بہت بڑے احسان کو جو انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ کیا تھا ہرگز فراموش نہ کرتے اور انگریزوں اور انگریزوں کی حکومت کے مقابلہ میں بغاوت نہ کرتے۔

ہم تو اس قول کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ساتھ کسی کے دل میں بغاوت کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ بلکہ بقول ایک بڑے مورخ مسٹر" کے وہ بغاوت نہیں تھی۔ صرف ایک سپاہیانہ وار تھی۔ اور جو فسادات کہ اُس زمانہ میں ہوئے وہ بدعملی ہوجانے کے سبب سے ہوئے۔ نہ اس وجہ سے کہ رعایا کو انگریزوں کے مقابل میں بغاوت کرنی مقصود تھی۔ مگر ہاں اس کا کچھ جواب نہیں ہے۔ کہ اس وقت کیوں ہندوستان کے مسلمانوں نے گورنمنٹ انگلستان اور گورنمنٹ فرانس کا شکریہ ادا نہیں کیا۔

پھر ۱۸۷۶ء میں دوبارہ ترکوں اور روسیوں کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں عثمان پاشا غازی کی بہادری کے کارنامے ہندوستان کی ہر ایک گلی اور کوچے میں مشہور تھے۔ مگر بدبختی سے ترکوں کی شکست ہوئی۔

اور ۱۸۷۸ء میں روسی پلونا اور درۂ شپکا کو فتح کرتے ہوئے قسطنطنیہ کی دیواروں تک جا پہنچے اُس وقت ترکوں کی سلطنت کے نیست و نابود ہو جانے میں کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ مگر گورنمنٹ انگریزی اُن کی حمایت کو اُٹھی۔ اور اپنے جنگی جہاز قسطنطنیہ کے سمندر میں بھیج دیئے۔ اور روس سے کہا کہ بس آگے قدم نہ بڑھائیں اور صرف انگلستان کے بیچ میں پڑنے سے برلن کا عہدنامہ تحریر ہوا۔ اور سلطنت ٹرکی جیسے کہ اس زمانہ میں ہے باقی رہی۔ اگر انگلستان ترکوں کی مدد نہ کرتا تو ترکوں کی سلطنت کا باقی رہنا محال تھا +

پس اب سوال یہ ہے کہ ایسی ہمدردی جو انگلستان کی طرف سے ترکوں کی نسبت ظاہر ہوئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اُس کا شکریہ کیوں نہیں ادا کیا +

ادہم پاشا نے یونانیوں کی حال کی لڑائی میں اُس سے زیادہ بہادری اور دلاوری نہیں دکھائی جس قدر کہ عثمان پاشا نے پلونا میں دکھائی تھی۔ پس کس وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں نے ادہم پاشا کا بہت شکر کیا۔ اور عثمان پاشا کی نسبت کچھ نہیں کیا۔ ہمارے پاس اس کا کچھ جواب نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جو کچھ اس وقت مسلمانوں نے کیا وہ صرف اُن کی ایک خفیف الحرکتی تھی۔ اور ایک کے دیکھا دیکھی اوروں نے بھی وہی کیا جو انہوں نے کیا تھا +

جو لوگ اس بات کا خیال کرتے ہیں۔ کہ مسلمانوں نے جو یونان کی فتح پر اس قدر خوشی منائی۔ وہ کسی پولیٹیکل امر پر مبنی تھی۔ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اور بجز خفیف الحرکتی کے اور کوئی امر نہیں ہے سلطان کو خلیفہ ماننا اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے جس طرح کہ بنی امیہ اور بنی عباس کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو سلطان ٹرکی کے احکام کو مثل احکام پوپ کے واجب التعمیل سمجھتا ہو یا مثل احکام خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے جانتا ہو۔ پس کسی طرح پر خیال نہیں ہو سکتا۔ کہ اُن کا خوشی منانا اور مبارکباد کے تار بھیجنا کسی پولیٹیکل امر پر مبنی ہو۔ گو کہ ہمارے نزدیک اُن کا ایسا کرنا بھی بلا اجازت گورنمنٹ کے جس کے کہ وہ رعیت ہیں ہرگز مناسب نہیں تھا +

اس وقت سلطان نے تھسلی کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے معاملہ میں تمام یورپ کی سلطنتوں کی رائے کو نہیں مانا ہم بھی نہیں چاہتے کہ سلطان تھسلی سے اپنا قبضہ اُٹھالے مگر معلوم نہیں کہ اس انکار کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور کون سلطنتیں سلطان کی دوست اور کون سلطنتیں اُس کی مخالف ہو جاینگی یا کوئی متوسط امر سب سلطنتوں کی صلاح سے قرار پائیگا۔ لیکن یہ باتیں پولیٹیکل معاملات سے علاقہ رکھتی ہیں۔ اِن کو مذہبی لباس پہنانا ہمارے نزدیک بالکل ناواجب ہے کیونکہ ہر ایک سلطنت اپنی پولیٹیکل مصلحت کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ خواہ وہ مصلحت ترکوں کے مقابلہ میں ہو خواہ روس جرمنی اور اٹلی کے مقابلہ میں۔ اور کبھی کوئی سلطنت اپنی پولیٹیکل مصلحت کو فروگذاشت نہیں کرتی۔ ہاں جو سلطنتیں کہ ضعیف ہیں اُن کی پولیٹیکل مصلحت یہی ہوتی ہے کہ جو سلطنت قوی ہے اُس کی رائے کو تسلیم کریں۔ کیونکہ اس میں وہ اپنی بھلائی تصور کرتی ہے۔ اور قوی سلطنت سے مقابلہ کرنا نہیں چاہتی۔ اس زمانہ میں تمام معرکہ آرائیاں اسی بنا پر ہوتی ہیں کسی مذہبی بنا پر +

ہندوستان اور انگلش گورنمنٹ

اور آخر کار جو ہونا تھا وہ ہؤا۔ اور جو ہونا ہے وہ ہو گا۔ ایک عظیم مصیبت ہندوستان پر غدر ۱۸۵۷ء کی گذر چکی تھی۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں تعلیم کی کمی تھی۔ اور ہندوستانی نہیں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ جس کی ہم رعیت ہیں۔ ہم پر اس کا کیا حق ہے۔ اور ہمارا اس کے ساتھ کیا فرض ہے اور تعلیم کی کمی سے آپس میں حاکم و محکوم میں ارتباط بھی کم تھا۔

اسی زمانہ کے قریب ہندوستان میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ جن کا مقصود ہندوستانیوں کو انگلش ایجوکیشن میں اعلےٰ درجہ تک تعلیم دینا تھا۔ بہت سے مدبران ملک ہندوستانیوں کو اعلےٰ درجہ کی تعلیم دینی پسند کرتے تھے اور کچھ ناپسند کرتے تھے۔ اور گورنمنٹ کا فرض قرار دیتے تھے۔ مگر اس بات پر کسی کا خیال نہ تھا کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا ہونا بھی لازم ہے۔ کیونکہ صرف تعلیم سے آدمی آدمی نہیں بنتا۔ اور اُس کے اخلاق درست نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ ایک مُنہ زور گھوڑے کی مانند ہو جاتا ہے۔ جو سوار کے قابو میں نہیں رہتا۔ تعلیم کا درخت جو ہندوستان میں بویا گیا وہ بنگال میں اور جنوبی ہندوستان میں بڑا ہؤا بخوبی پھلا اور پھولا اور بار آور ہؤا۔ مگر آخر کار بار خاطر ہؤا۔ نہ یار شاطر۔ اپر انڈیا[1] کے باشندوں نے عام طور پر اور تمام ہندوستان میں مسلمان قوم نے اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کیا۔ مسلمانوں نے اب اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا ہے معلوم نہیں کہ پھل لانے یعنی اعلےٰ تعلیم تک پہنچنے کے بعد وہ بھی بار خاطر ہونگے یا یار شاطر۔ مگر ہماری رائے یہ ہے۔ کہ اگر اشراف خاندان کے مسلمانوں کے لڑکوں کو اعلےٰ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہوئی اور درستی اخلاق کا بھی سبق پڑھایا گیا۔ اور ان کی عمدہ سوسائٹی بن گئی جو درستی اخلاق کے لئے نہایت ضرور ہے۔ تو اعلےٰ تعلیم تک پُہنچنے پر وہ بار خاطر نہ ہونگے۔ بلکہ یار شاطر ہونگے۔ بہر حال اس وقت جو تعلیم ہندو بنگالیوں کو۔ بمبئی کے پارسیوں کو۔ بمبئی و پونا کے برہمنوں اور مرہٹوں کو دی گئی اور جس کو اعلےٰ درجہ کی تعلیم کہا جاتا ہے۔ اس سے ہندوستان کے حق میں کوئی اچھا پھل ہاتھ نہیں لگا۔ پہلے تو انہوں نے اپنے تئیں اعلےٰ درجہ کا تعلیم یافتہ اور اعلےٰ درجہ کا اسٹیٹسمین یعنی مدبر امور سلطنت سمجھ لیا۔ پھر اس بات کے درپے ہوئے کہ انگلش گورنمنٹ جس طرح کہ یورپ میں حکومت کرتی ہے۔ اُسی طرح ہندوستان میں حکومت کرے۔ اور گورے کالے اور فاتح مفتوح میں کچھ فرق نہ سمجھے۔ پھر انہوں نے اس تعلیم سے ایک لفظ آزادی کا سیکھا۔ اور اس کے معنی یہ سمجھے کہ جو کچھ مُنہ میں

[1] شمالی ہند

آوے یا خیال میں گذرے۔ بلا لحاظ اس بات کے کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔ موقع ہے یا بے موقع اس کی تائید کے لئے کافی دلیلیں ہیں یا نہیں۔ اس سب کو کہنا اور چھاپنا اور تمام ہندوستان میں شائع کرنا ہے +

پھر انہوں نے ایک لفظ ایجی ٹیشن کا سیکھا اور کہا کہ دیکھو آئرلینڈ والے کیسا ایجی ٹیشن گورنمنٹ کی تجویزوں پر کرتے ہیں۔ انجمنیں اور سوسائٹیاں ایجی ٹیشن کے لئے بناتے ہیں۔ اور اسپیچوں اور تحریروں میں جو کچھ چاہتے ہیں کہتے ہیں۔

پھر ان کے خیال میں گذرا کہ انگریزی گورنمنٹ اسی قسم کی گورنمنٹ ہے۔ کہ وہ علم ایجی ٹیشن سے ڈرتی ہے۔ اور جب تک ایجی ٹیشن نہ کیا جاوے۔ اُس وقت تک کوئی مطلب انگلش گورنمنٹ سے حاصل نہیں ہوسکتا +

پھر وہ سمجھے کہ ایجی ٹیشن جب تک عام نہ ہو۔ اور عام رعایا یا ملک کے باشندے ایجی ٹیشن پر متفق نہ ہوں۔ اُس وقت تک نہ ایجی ٹیشن ہوسکتا ہے۔ اور نہ مفید ہوتا ہے۔ انہوں نے ایجی ٹیشن کے عام کرنے پر کوشش شروع کی +

جب تک کہ گورنمنٹ کی بُرائیاں صحیح یا غلط واجب یا ناواجب عام لوگوں میں نہ پھیلائی جاویں۔ اُس وقت تک بمقابلہ گورنمنٹ کے عام ایجی ٹیشن کی بنیاد قائم ہی نہیں ہوسکتی۔ اس خیال پر نیشنل کانگرس کا وجود ہوا۔ اور اُس نے گورنمنٹ کی نسبت جہاں تک ہوسکا برائیوں کو تمام ہندوستان میں پھیلایا۔ اور جن باتوں پر اس سے پہلے لوگوں کو خیال بھی نہ تھا۔ ان کو ایک بُرائی کے پیرایہ میں بیان کرکر لوگوں کو چوکنا کر دیا۔ اور برٹش گورنمنٹ کی صورت کو ایک خودغرض گورنمنٹ اور ہندوستان کو لوٹنے والی گورنمنٹ بناکر لوگوں کو دکھایا۔ اور اپنے گروہ کو ایک تعلیم یافتہ لوگوں کا گروہ قرار دیا۔ جن کی پیروی اُن تمام لوگوں نے اختیار کی جو کالجوں سے تعلیم پاچکے تھے۔ اور جو تعلیم پا رہے تھے۔ یہاں تک کہ اسکول کے لڑکوں نے جو اے۔ بی۔ سی۔ ڈی کا تلفظ بھی بخوبی ادا نہیں کرسکتے تھے۔ ان کی پیروی کرنا اور تعلیم یافتہ گروہ میں شامل ہونا اپنا فخر سمجھا +

ہم ہرگز اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ ایجی ٹیشن کرنے والوں کا جو گروہ ہے اس کی نیت گورنمنٹ سے بغاوت کرنا یا لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا ہے۔ مگر جو کچھ انہوں نے کیا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اس سے عام ناراضی کا گورنمنٹ سے پھیلانا لازم اور ضروری ہے۔ اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ وہ ناراضی اکثر بلکہ عموماً ناواجب اور محض بے جا ہے۔ اور اس سے از خود باغیانہ خیالات لوگوں میں پیدا ہوتے ہیں +

بیشک یہ ناراضی پھیلانے والے اپنے تئیں خیر خواہ اور وفادار گورنمنٹ کا کہتے ہیں۔ اور غالباً سچ بھی ہو۔ مگر جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اس سے عام رعایا میں ناراضی اور گورنمنٹ سے برخلافی پیدا ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی باہمی بات چیت میں جو گورنمنٹ سے متعلق ہے۔ ٹرن بدلی ہوئی ہے۔ تمام یا قریباً تمام اخباروں کی وہ اردو زبان کے ہوں یا ہندی کے یا مرہٹی زبان کے ہوں یا گجراتی کے یا انگریزی زبان کے ہوں جو ہندوستانیوں کی جانب سے جاری ہیں تو بدلی ہوئی ہے۔ اور اس بات سے کہ انہی وجوہات سے بہ نسبت سابق کے عام لوگوں کے دلوں میں گورنمنٹ سے ناراضی پھیل گئی ہے۔ کوئی انکار نہیں کر سکتا +

مسلمان سوائے بعض کے اب تک نیشنل کانگرس میں اور اس کے ایجی ٹیشن میں شامل نہیں ہوئے ہیں۔ اور جو شامل ہوئے ہیں۔ انہوں نے نہیں سمجھا کہ اس سے قوم کو اور ملک کو کیا نقصان پہنچتا ہے۔ اور آیندہ پہنچیگا +

جو لوگ کہ ایجی ٹیشن کی مخالفت کرتے ہیں۔ اُن کی نسبت ایجی ٹیشن کرنے والے کہتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کی خوشامد کرتے ہیں۔ ان کا جو دل چاہے کہیں۔ مگر ایجی ٹیشن سے مخالفت کرنے والے اپنے دلی یقین سے یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ اگر ان ایجی ٹیشن کرنے والوں کی خواہشیں منظور کرلے (حالانکہ ایسا ہونا ناممکن ہے) تو ہندوستان کے انتظام اور اس کے امن امان میں خلل عظیم واقع ہوگا۔ اور اسی یقین پر وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں نہ گورنمنٹ کی خوشامد سے +

اگرچہ مسلمان نیشنل کانگرس کے ایجی ٹیشن میں شریک نہیں ہوئے لیکن اکثر ان اخباروں نے بھی سوائے بعض کے جو مسلمان ایڈیٹروں کے ہاتھ میں ہیں اور اخباروں کی دیکھا دیکھی اپنے جامہ سے قدم باہر رکھدیا ہے۔ اور مضامین کی تحریر میں ان کے قلم میں بھی کوئی روک نہیں رہی جو نہایت افسوس کے قابل ہے۔ مگر ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اگر بالفرض ہندوستان کے تمام ہندو اور مسلمان نیشنل کانگرس کے ساتھ ایجی ٹیشن میں شریک ہوجاویں اور تمام اخبار ہندو اور مسلمانوں کے مضامین خلاف واقع اور برخلاف گورنمنٹ لکھنے پر متفق ہوجاویں۔ تو بھی گورنمنٹ کا کچھ نقصان نہیں ہونے کا۔ ہاں بمجبوری گورنمنٹ کو دائرہ آزادی کو جو اس وقت ہے زیادہ تنگ کرنا پڑیگا۔ اور بمجبوری اس کو ہندوستانی اخباروں کی آزادی چھین لینے پر قانون بنانا ہوگا۔ اور یہ گورنمنٹ کا کچھ قصور نہیں ہوگا۔ جو کچھ گورنمنٹ کریگی وہ ہندوستانیوں ہی کی بداعمالی کی سزا ہوگی +

کون کہ سکتا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جو گورنمنٹ نے تمام ہندوستان سے ہتھیار چھین لئے اور بغیر لیسنس کے کسی کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ اس میں گورنمنٹ کا

کچھ قصور ہی نہیں۔ بلکہ یہ ہندوستانیوں کے اعمال کی سزا ہے جو انہوں نے غدر ۱۸۵۷ء میں کئے تھے۔ ہر ایک انصاف کرنے والا سمجھتا ہوگا کہ ہندوستانیوں نے اپنی بد اعمالی ایسے درجہ کو پہنچادی تھی کہ گورنمنٹ کو بمجبور قانون اسلحہ کا جاری کرنا پڑا تھا +

جن لوگوں نے اس زمانہ میں ترکی فتحیابی ہندوستان میں متعدد جلسے کئے اور سلطان کو مبارکبادی کے تار اور ایڈریس بھیجے وہ خود سمجھتے ہونگے۔ کہ اس خفیف الحرکتی سے کیا نتیجہ ہے یورپ کی سلطنتوں کی پالیسی ٹرکی کی نسبت جو ہوئی ہے وہ تبدیل نہیں ہوسکتی ہندوستان کے مسلمان سلطان ٹرکی کی کیا مدد کرسکتے ہیں۔ اور اس خوشی منانے سے سلطان کو کیا فائدہ ہوا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو جنہوں نے یہ خوشی منائی کیا نتیجہ حاصل ہوا بجز اس کے کہ چند حمقا اور جاہلوں نے یہ سمجھا کہ سلطان ٹرکی کی فتحیابی پر خوشی منانے والے نہایت پکّے مسلمان ہیں۔ جو سلطان کی فتحیابی پر خوشی مناتے ہیں۔ اور خوشی منانے والوں نے اپنی بزرگی اور تقدس کو احمقوں اور جاہلوں کے نزدیک ثابت کرنا چاہا +

ہم جب ان کو بڑا دیندار سمجھتے کہ وہ روس کی رعیّت ہوتے اور سلطان ٹرکی کی فتحیابی پر اسطرح پر جشن مناتے اور خوشیاں کرتے معلوم نہیں کہ کتنے آدمی پھانسی پاتے اور کتنے گولی سے مارے جاتے اور کتنے سائبیریا بھیجے جاتے (غالباً گورنمنٹ نے بھی اس کو ناپسند کیا ہوگا- مگر یہ انگلش گورنمنٹ ہی کا رحم ہے جس نے ان باتوں پر کچھ مواخذہ نہیں کیا +

تمام ہندوستان کے باشندوں کی اور بالتخصیص مسلمانوں کی خیر و عافیت اسی میں ہے کہ سیدھی طرح انگلش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں اپنی زندگی بسر کریں۔ اور خوب سمجھ لیں کہ مذہب اسلام کی یہی ہدایت ہے۔ کہ جن کی ہم رعیّت ہوکر اور مستامن ہوکر رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ وفادار رہیں اور ان کی بدخواہی نہ اپنے دل میں لاویں نہ بدخواہوں کے ساتھ شریک ہوں۔ اُن کو اپنا دنیوی شہنشاہ اور خداوند تعالےٰ جلشانہ کو شہنشاہوں کا شہنشاہ اور اپنا مالک حقیقی سمجھتے رہیں۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے بوستاں میں لکھا ہے ؎

سزد گر بدورش بنازم چناں   کہ سیّد بدورانِ نوشیرواں

جس کا مطلب یہ ہے کہ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم خدا کا شکر فرماتے تھے کہ وہ سلطان عادل یعنی نوشیرواں کے عہد میں پیدا ہوئے۔ نوشیرواں آتش پرست بادشاہ تھا لیکن عادل تھا اس کے زمانہ میں پیدا ہونے پر اگر رسولِ خدا صلّے اللہ علیہ وسلّم نے خدا کا شکر کیا ہے تو ہم کو ایسے بادشاہ کی رعیّت ہونے سے جس نے ہمارے مذہبی امور بجالانے میں ہم کو کمال آزادی دے رکھی ہے کیوں نہ خدا کا شکر بجالاویں اور اس کی درازی عمر و دولت و اقبال کی کیوں نہ خدا سے دعا کریں +

ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط

جس قدر سوشئل برتاؤ اور باہمی محبت وارتباط ہندو اور مسلمانوں میں ترقی پکڑتا جاوے۔ ہم کو نہایت خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ ہندوں کی آریا قومیں بھی خاص ہندوستان کی رہنے والی نہیں ہیں۔ دوسرے ملک سے آکر ہندوستان میں فتحمندی کے ساتھ آباد ہوئی ہیں۔ ان کے ہندوستان میں آباد ہونے کو زمانہ کثیر گذر گیا۔ جس کے سبب وہ ہندوستان کے متوطن اور ہندوستان کے رہنے والے ہندو کہلائے مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں آئے ہوئے کچھ کم زمانہ نہیں ہوا۔ ان کی بھی متعدد پشتیں ہندوستان ہی کی زمین پہ گذری ہیں۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا بھی میل ہے۔ بہت سے ایسے ہیں۔ جو خالص آریہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ صدیاں گذر گئیں۔ کہ ہم دونو ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی زمین کی پیدوار کھاتے ہیں۔ ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں۔ پس مسلمانوں اور ہندوں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاسکتے ہیں (ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے۔ اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں) اس کی خوبصورتی اس میں ہے۔ کہ اُس کی دونو آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر اُن میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہوجاویگی۔ اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی۔ تو کانی ہوجاویگی۔ ہم دونوں کی سوشئل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے۔ بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آگئی ہیں۔ پس جس قدر ان دونو قوموں میں زیادہ تر محبت زیادہ تر اخلاص زیادہ تر ایک دوسری کی امداد بڑھتی جاوے۔ اور ایک دوسرے کو مثل بھائی کے سمجھیں۔ کیونکہ ہم وطن بھائی ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں۔ اُسی قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں تین باتوں سے اس محبت و اخلاص کا علانیہ ثبوت دیا گیا ہے۔ سب سے اوّل یہ بات ہے۔ کہ ان دنوں میں سلطان کی کی یونان پر فتح ہونے کی اکثر جگہ مسلمانوں نے خوشی کی اور مجلسیں آراستہ کیں۔ بہ شہر میں چراغاں روشن کئے۔ سلطان کو مبارکبادی کے تار بھیجے۔ ہم نے سُنا ہے۔ کہ دکن کے ہندوؤں نے بھی

اسی طرح خوشی منائی۔ اور سلطان کو مبارک آباد کے تار بھیجے۔ جو کافی ثبوت دو نو قوموں میں اخوت کا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے سُنا ہے۔ کہ بریلی میں ہندو مسلمانوں نے نہایت خوبی سے ایک دوسری کی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی بقرعید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی۔ بلکہ ہندوؤں کی خاطر سے بکرے اور بھیڑوں کی قربانی کی۔ اور ہندوؤں نے بھی اس بات کا خیال اٹھالیا۔ کہ کوئی مسلمان گائے کی قربانی کا خیال کرتا ہے۔ یا بکرے بھیڑی کی۔ اور ہندوؤں نے محرم کے زمانہ میں سبیلیں لگانے کا اور مسلمانوں کے ساتھ غم میں شریک ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو۔ تو گائے کی قربانی نہ کرنا اُس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ تیسری بات یہ ہے۔ کہ سول ڈویژن مانک پور گنج ضلع ڈھاکہ میں ایک مسجد بنانے کی ضرورت ہے۔ اور اُس مسجد کی تعمیر کے لئے روپیہ جمع کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں نے شامل ہو کر کمیٹی بنائی ہے۔ اور ہندو اور مسلمان ملکر اُس کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان زیادہ غریب اور زیادہ ذلیل ہیں۔ اس لئے ہندو اُس مسجد کی تعمیر کے لئے زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس محبت و ہمدردی اور باہمی بھیا چارہ پر جو ہندوؤں نے ظاہر کی ہے۔ دونو قوموں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں جس طرح کا اختلاف مذہب جیسا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہے۔ سوشئل برتاؤ اور باہمی محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پولٹیکل امور کا اختلاف بھی سوشئل برتاؤ اور باہمی محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہے۔ اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان دونو گورنمنٹ انگلشیہ کی رعایا ہیں۔ اور اُس کے سایۂ عاطفت میں ہر قسم کی خوشی اور امن و آزادی سے بسر کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ دونوں قوموں کے باہم پولٹیکل امور میں اختلاف رائے ہے۔ ہندو اُس پولٹیکل پالیسی کے طرفدار ہیں۔ جو کانگرس کے اعلےٰ ممبروں یا اُس کے حامیوں اور طرفداروں کی ہے۔ اور جس کا ہر سال مختلف مقامات میں کانگرس کے نام سے اعلان کیا جاتا ہے۔ اور اس پر زور دیا جاتا ہے۔ مسلمان اُس پالیسی کے برخلاف ہیں۔ لوگ اُن پر اتہام لگاتے ہیں۔ کہ گورنمنٹ کے خوشامدی ہیں۔ لیکن یہ اتہام غلط ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے نزدیک ملک کے انتظام اور امن میں

اُس پالیسی سے خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اور کسی طرح وہ پالیسی ہندوستان کی حالت کے مناسب نہیں ہے پس اس اتحاد و یکجہتی سے جو اُس وقت ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ ظاہر کی ہے۔ اگر یہ مقصود ہو کہ مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ کانگرس میں اور اُن کی پالیسی میں شریک ہو جائیں گے۔ تو ہمارے نزدیک اس مقصد کا حاصل ہونا محالات سے ہے اور ملک کے انتظام اور امن میں نہایت خلل ڈالنے والا ہے۔ گو بعض ناعاقبت اندیش اور امور مملکت سے ناواقف اور ناشدنی باتوں پر یقین کرنے والے مسلمانوں ہندوؤں کی پالیسی میں شریک اور کانگرس کے جلسوں میں شامل ہو جاویں مگر عموماً مسلمان اُس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ بلاشبہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہم اختلاف مذہب سے قطع نظر کر کے ہندو مسلمانوں میں دوستی و محبّت و یگانگت اور آپس میں ہمدردی کا برتاؤ چاہتے ہیں۔ اسی پولٹکل اختلاف رائے سے بھی قطع نظر کر کے سوشئل امور میں باہم دوستی و محبّت و ہمدردی و بھائی بندی کا برتاؤ چاہتے ہیں۔ اور ہم یقین کرتے ہیں۔ کہ اس زمانہ میں جو غیر معمولی طریقہ پر ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ بھائی بندی و ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک دھوکا مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ سچی بھائی بندی۔ سچی ہمدردی اور سچی ہموطنی کا سبب ہے اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں۔ کہ ایسا ہی ہو۔ اور ہم دونوں قوموں میں نہایت محبّت و اخلاص سے گورنمنٹ انگلشیہ کے سایۂ عاطفت میں اپنی زندگی نہایت وفاداری سے بسر کریں۔ اور ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصر انڈیا کی سلامتی اور درازی سلطنت کی دعا کرتے رہیں۔ جس کی بے نظیر سلطنت کے ساٹھویں سال جلوس کا عنقریب جشن ہونے والا ہے ؞

پردہ

ان دنوں میں عورتوں کے پردہ کی نسبت متعدد تحریرات اخباروں میں شائع ہوئی ہیں۔ اور ہمارے بعض عزیز جن کو ہم لحمک لحمی کہہ سکتے ہیں۔ اور بعض ہمارے مخدوم جن کو ہم فخر قوم کہہ سکتے ہیں۔ پردہ کے مخالف ہیں۔ مگر ہم کو گو لوگ نئے فیشن کا سمجھیں۔ مگر ہم تو اُسی پرانے دقیانوسی اگر فیشن کے نہیں ہیں۔ تو دقیانوسی مزاج کے تو ضرور ہیں۔ اور اس لئے ہم اپنے مخدوموں کی رائے کے مخالف ہیں۔ اور عورتوں کا پردہ جو مسلمانوں میں رائج ہے۔ اُس کو نہایت عمدہ سمجھتے ہیں +

اس بات پر بحث کرنی کہ قرآن مجید سے پردہ مرّوجہ عورات اہل اسلام ثابت ہوتا ہے یا نہیں محض فضول ہے۔ کیونکہ اگر مسلمان مرد اپنے افعال و عادات میں پابند شریعت اور تابع احکام قرآنی ہوتے تو اس وقت عورتوں کے پردہ کی بابت اس بات کی گفتگو کرنی کہ قرآن مجید سے مرّوجہ پردہ ثابت ہے یا نہیں زیبا ہوتی۔ مگر جب ہمارے مردوں کی نسبت قرآن مجید کے کسی امر کے اتباع کی نسبت بحث نہیں کی جاتی۔ تو عورتوں کے پردہ کی نسبت یہ بحث کرنی کہ قرآن مجید سے ثابت ہے یا نہیں کیسی نازیبا معلوم ہوتی ہے +

یہ خیال کرنا۔ کہ اگر پردہ کی رسم اُٹھ جائے تو ہندوستانیوں کو انگریزوں سے زیادہ راہ و رسم اور ارتباط کا موقع ملے گا محض غلط خیال ہے۔ پہلے تم اپنے تئیں تو انگریزوں سے ملنے اور ارتباط پیدا کرنے کے لائق بنا لو۔ پھر عورتوں کی طرف متوجہ ہونا ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

عجائبات کا ذہول اور عجائبات کا قبول

ہیں! تم نے یہ کیسی متضاد باتیں کہیں؟ حضرت میں کیا کروں؟ انسان کی جبلت ہی ایسی متضاد باتوں پر واقع ہوئی ہے۔ اس متضاد جبلت کے سبب بڑے بڑے بزرگوں یہاں تک کہ انبیا علیہم السلام کو بھی نہایت مشکلیں پیش آئی ہیں۔ مذہب سی عمدہ چیز کا بھی اسی جبلت نے ستیاناس کر دیا ہے +

حضرت اب تک تو ہماری سمجھ میں یہ معمّا نہیں آیا؟ اگر آپ کچھ تفصیل سے بتاویں تو شاید سمجھ میں آوے؟

میاں سمجھو! دنیا میں قدرتی عجائبات اس قدر ہیں۔ کہ انسان نہ اُن کو سمجھ سکتا ہے نہ گن سکتا ہے۔ دن کا ہونا۔ رات کا آنا۔ چمکدار سورج کا نکلنا۔ باریک چاند کا دکھائی دینا۔ اور پھر بڑھتا جانا۔ بدر ہونا۔ اور اپنی چاندنی سے اندھیری دنیا کو روشن کرنا۔ پھر گھٹتا جانا۔ اور پہلی طرح باریک سا ہو کر چھپ جانا۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے۔ کالی گھٹا کا اُٹھنا۔ بڑے بڑے پہاڑوں سے بھی بڑے دَل بادلوں کا جمع ہو جانا۔ ہوا کے جھونکے سے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرنا۔ بجلی کا چمکنا دل کو ہلانا۔ مینہ کے توقع سے دل خوش کرنا۔ پھر مینہ کا برسنا۔ اولوں کا پڑنا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہیں؟

درختوں کا اُگنا۔ اُن کے ہرے ہرے پتّوں کا نکلنا طرح بطرح۔ رنگ برنگ کے پھولوں کا پھولنا۔ درختوں کی شاخوں میں طرح بطرح کے میووں کا لٹکنا۔ اُن کے مزوں کا مختلف ہونا۔ کیا عجائبات کے قدرت سے نہیں ہے +

پرندوں کا ہوا میں اُڑنا۔ آسمان و زمین میں معلّق رہنا۔ بئے کا عجیب طرح پر گھونسلا بنانا شہد کی مکھی کے کرتب۔ اس کا نہایت اعلےٰ اصول۔ اقلیدس پر چھتا بنانا۔ پہاڑوں پر اور اونچی اونچی جگہوں میں لگانا۔ ہر ایک قسم کے مفید پھولوں سے رس چوس کر لانا۔ اور مختلف رنگوں کا شہد بنانا۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟

گائے۔ بھینس۔ اور لال گائے۔ بکری سے جن کے پیٹ میں جنگل کا چارا سڑ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ سفید اور شیریں مزے دار دودھ کا نکلنا۔ اُس سے اُن کے بچوں کی پرورش ہونا۔ اور انسان اور اُس کے بچّوں کے لئے نہایت عمدہ اور مفید غذا کا ہونا۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟

خود۔ انسان کا بلکہ تمام حیوانات کا۔ اور انڈے سے مرغی کا اور مرغی سے انڈے کا پیدا ہونا۔ پھر اُن کا دلکش آوازوں سے بولنا۔ چہچہانا۔ انسان کا اپنے قوائے عقلی۔ اور دماغی سے ایسے اعلیٰ درجہ تک پہنچنا۔ جہاں بقول شخصے جبرئیل کے بھی پر جلتے ہیں۔ کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟

مگر جو کہ یہ باتیں روزمرّہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ اُن کا عجیب بلکہ عجیب تر ہونا۔ انسان کے خیال میں نہیں رہتا۔ اور اُس سے ذہول ہو جاتا ہے۔ مگر انسان جب کسی مذہب پر اعتقاد لاتا ہے۔ یا کسی شخص کو مقدس سمجھتا ہے تو عجائبات کو اُس کے ساتھ لگاتا ہے۔ اور جو عجائبات اُس کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔ اُن سب کو قبول کرتا ہے۔ بلکہ بغیر اُن عجائبات کے مذہب کی حقیت یا اُس شخص کے تقدّس کو تسلیم نہیں کرتا۔

حضرت نوح علیہ السلام کو کتنا ہی مُقدّس اور خدا کا پیغمبر کہا جاوے۔ مگر جب تک طوفانِ نوح کو ایسا نہ مانا جاوے کہ ایک بڑھیا کے تنور میں سے پانی اُبلنا۔ اور مینہ ایسے زور شور سے چالیس دن رات برستا رہا۔ جس کے سبب تمام دُنیا ڈوب گئی۔ بلند سے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے بھی پانی اونچا ہو گیا۔ اور حضرت نوح ؑ نے خدا کے حکم سے کشتی بنائی۔ اور کشتی کے تختے فرشتے بہشت سے لائے۔ پھر اُن کی دُعا سے طوفان موقوف ہوا۔ اور تمام دُنیا کے انسان اور جانور سوائے اُن کے جو کشتی میں تھے۔ سب ڈوب کر مر گئے۔ اُس وقت تک حضرت نوح علیہ السلام کی نبوّت اور اُن کا تقدّس قبول ہی نہیں ہو سکتا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت اگر یہ یقین نہ کیا جاوے کہ وہ تمام جانوروں کی باتیں سمجھتے تھے۔ اور ہوا اُن کے تخت کو اُڑائے پھرتی تھی۔ اور جنّ اور پری اُن کے تابع تھے اُس وقت تک اُن کا مقدّس ہونا اور نبی ہونا تسلیم نہیں کیا جاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت جب تک یہ یقین نہ کیا جاوے۔ کہ خدا اُن سے باتیں کرتا تھا۔ اور اُس نے اپنی اُنگلی سے پتھر کی تختیوں پر توریت لکھی تھی۔ اور وہ لکڑی کو سانپ بنا دیتے تھے اور سمندر کو چیر کر چلے گئے تھے۔ اُس وقت تک اُن کا نبی ہونا نہیں مانا جاتا۔

حضرت یوشع کے حکم سے اگر آفتاب کا ٹھیر جانا۔ نہ مانا جاوے۔ تو گویا اُن کی نبوّت ہی کو نہیں مانا۔

اگر یہ نہ مانا جاوے۔ کہ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نگل گئی تھی۔ اور تین دن تک وہ اُس کے پیٹ میں رہے۔ اور پھر اُس نے اُن کو کنارے پر اُگل دیا۔ اور پھر وہ جیتے جاگتے نکل آئے۔ اُس وقت تک گویا اُن کے تقدّس اور نبوّت کا یقین ہی نہیں ہوتا۔

جب تک یہ نہ مانا جاوے۔ کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اور مُردوں کو جِلاتے تھے۔ اور کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کرتے تھے۔ پھر مع اپنے جسم کے آسمان پر چلے گئے۔ اور چوتھے آسمان پر بیٹھے ہیں۔ اُس وقت تک گویا حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کا یقین ہی نہیں کیا جاتا +

رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ فرماتے رہے۔ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ۔ مگر لوگوں نے اس پر قناعت نہ کی۔ اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی بہت سے عجائبات منسوب کردئے۔ اور اُنہیں عجائبات پر یقین رکھنا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی تصدیق کرنا قرار پایا ہے +

یہی خیال اولیاء اللہ تک بھی پہنچ گیا۔ جب تک کہ اُن میں کرامتیں نہ مانی جائیں۔ اور اُن پر یقین نہ کیا جاوے۔ کہ ولیوں نے مُردوں کو بھی زندہ کردیا ہے۔ اور برسوں کی ڈوبی ہوئی برات کو دریا میں سے زندہ نکال دیا۔ اور چُنیں اور چُناں کیا۔ اُس وقت تک اُن کے ولی ہونے پر بھی یقین نہیں ہوتا +

غرض کہ انسان کی یہ جبلّت ہے کہ جس چیز کو بزرگ سمجھتا ہے۔ اور جن اشخاص کو مقدس جانتا ہے۔ اُن کی نسبت ایسے عجائبات منسُوب کردیتا ہے۔ یہی باعث ہے۔ کہ مذہب اسلام میں بھی لوگوں نے بہت سے عجائبات شامل کردیئے ہیں جو قابل یقین نہیں ہیں۔ مگر وہ لوگ اُن کو قبول کرتے ہیں +

رفتہ رفتہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جم گئی ہے کہ عجائبات کے بغیر نہ مذہب چلتا ہے نہ لوگ ایسے مذہب کو جس میں کچھ عجائبات نہ ہوں قبول کرتے ہیں +

مگر یہ سخت غلطی ہے۔ کوئی مذہب جو سچّا ہے۔ اور سچّا ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے۔ اُس میں کبھی ایسے عجائبات نہیں ہوتے جو فطرت کے خلاف ہوں عقل انسانی کے خلاف ہوں۔ اور کوئی سمجھدار آدمی اُن کو تسلیم نہ کرے۔ بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے۔ گو کہ بعد کو اس کے ماننے والوں نے عجائبات پرستی کی راہ سے اُس میں بہت سے عجائبات شامل کردیئے ہیں +

مذہب اسلام کی نسبت ہم دل سے یقین کرتے ہیں۔ کہ وہ ایسی عجیب کہانیوں اور ایسی حیرت انگیز خلاف فطرت اور خلاف عقل باتوں سے پاک ہے اور اُس میں جس قدر حصہ عجائبات کا ہے وہ ان عجائب پرستوں کا شامل کیا ہوا ہے جو قدرت کے عجائبات کو ڈھول کرتے ہیں۔ اور خلاف قدرت اور خلاف عقل عجائبات کو قبول کرتے ہیں۔ خدا ان عجائب پرستوں سے بچائے +

بحث ناسخ ومنسوخ

ہم کو ہمارے ایک دوست نے اطلاع دی ہے۔ کہ ہم نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد میں جہاں ناسخ ومنسوخ کی بحث کی ہے۔ امام فخرالدین رازی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ آیت مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا سے قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اور دو آیتیں ہیں۔ اُن سے ثابت ہوتا ہے۔ پہلی آیت تو "یمحوا اللّٰہ ما یشاء ویثبت وعندہٗ اُمّ الکتاب" ہے۔ دوسری آیت "اذا بدّلنا اٰیۃً مکان اٰیۃٍ" ہے۔ اور ہم نے لکھا تھا۔ کہ ان دو نو آیتوں سے بھی قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اور وعدہ کیا تھا۔ کہ ہم ان دونو آیتوں کی تفسیر میں اُس کو بیان کرینگے۔ مگر سورۂ رعد اور سورۂ نحل میں جہاں ان آیتوں پر بحث کرنے کا موقع تھا۔ ہم بحث کرنی بھول گئے اور اس لئے اب اُن پر بحث کرتے ہیں ✦

پہلی آیت سورہ رعد کی ہے۔ اس میں خدا فرماتا ہے۔ کہ

ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک وجعلنا لھم ازواجاً وذریۃً وما کان لرسولٍ ان یاتی باٰیۃٍ الا باذن اللّٰہ لکل اجلٍ کتاب یمحوا اللّٰہ ما یشاء ویثبت وعندہٗ اُمّ الکتاب	بیشک ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ہیں۔ اور اُن کو بیبیاں اور اولاد دی ہے۔ اور کوئی رسول نہیں کر سکتا۔ کہ بغیر حکم خدا کوئی حکم لے آئے اور ہر ایک چیز کا وقت لکھا ہوا یعنی مقرر ہے۔ خدا جو چاہے مٹائے اور جو چاہے قائم رکھے

اور اس کے پاس اصل کتاب ہے ✦

اس آیت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ جو کچھ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ وہ انبیاء سابق کی شریعت سے متعلق ہے۔ نہ قرآن مجید کی آیتوں سے نتیجہ اس تمام آیت کا یہ ہے کہ انبیاء سابق کی شریعت میں سے جن احکام کو خدا چاہتا ہے۔ قائم رکھتا ہے اور جن احکام کو چاہتا ہے اُٹھا دیتا ہے۔ اور اس آیت سے کسی طرح سے یہ بات نہیں نکلتی کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے منسوخ ہو جاتی ہے پس یہ آیت قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ ہونے پر کسی طرح دلالت نہیں کرتی۔ مگر یہ بحث باقی رہتی ہے۔ کہ امّ الکتاب کیا چیز ہے۔ اور اگر امّ الکتاب سے لوح محفوظ مراد لی جاوے۔ تو لوح محفوظ کیا چیز ہے۔ یہ ایک بہت بڑی بحث ہے جس کو ہم اپنی تصنیفات میں متعدد جگہ لکھ چکے ہیں۔ مگر اس مقام میں اس کی بحث سے کچھ تعلق نہیں۔

بلکہ صرف یہ بات ثابت کرنی تھی - کہ "یمحوا اللہ مایشاء ویثبت" سے مقصود محو ہونا یا ثابت رہنا احکام شریعت انبیاء سابق کا ہے - نہ محو ہونا یا ثابت رہنا قرآن مجید کی آیتوں کا - اس لیئے ہم اسی قدر بیان پر اکتفا کرتے ہیں +

دوسری آیت سورہ نحل کی ہے جس میں خدا فرماتا ہے - کہ

واذا بدلنا ایۃ مکان ایۃ واللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون -	جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم بدلتے ہیں - اور خدا جو حکم نازل کرتا ہے اُس کو خوب جانتا ہے تو کہتے ہیں کہ تو تو افترا ہی کرنے والا ہے - حالانکہ ان میں کے بہت سے نہیں

جانتے + اس آیت کی نسبت سوال یہ ہے - کہ قالوا سے کون لوگ مراد ہیں - مفسرین لکھتے ہیں کہ قالوا کی ضمیر سے کفار مکہ مراد ہیں - مگر یہ صحیح نہیں ہو سکتا - اس واسطے - کہ کفار مکہ نہ اُس پہلی آیت کو جو بدلی گئی - مُنزل من اللہ جانتے تھے - اور نہ اس دوسری آیت کو جس نے پہلی آیت کو بدلا مُنزل من اللہ سمجھتے تھے +

بلکہ صرف یہود و نصاریٰ جو اُن احکام قرآن مجید کو جو برخلاف احکام سابق توریت و انجیل کے تھے پیغمبر کا افترا سمجھتے تھے - پس قالوا کی ضمیر انہیں یہود و نصاریٰ کی طرف پھرتی ہے نہ عام کفار کی طرف جو عموماً بت پرست تھے - اور وہ نہ احکام سابق کو مانتے تھے - نہ احکام لاحق کو - پس صاف ظاہر ہے - کہ بدلنا ایۃ مکان ایۃ سے تبدیل شرائع انبیاء سابق مراد ہے - نہ تبدیل آیۃ قرآنی کی - دوسری آیت سے +

تفسیر کبیر میں بھی ابو مسلم اصفہانی کا یہ قول نقل کیا ہے - کہ اس آیت میں شرائع سابق انبیاء کا تبدیل ہونا مراد ہے - نہ قرآن مجید کے احکام میں ایک سے دوسرے کا منسوخ ہونا - اور امام صاحب نے لکھا ہے - کہ ابو مسلم اصفہانی برخلاف دیگر مفسرین کے مذہب اسلام میں ناسخ و منسوخ کا بالکل قائل نہیں ہے +

اور اس میں کچھ شک نہیں ہے - کہ اگر اُن تمام آیتوں کو جن سے مفسرین اور فقہا نے قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ ہونے کا دعوےٰ پیش کیا ہے مجموعی طور پر سامنے رکھ لیا جاوے - اور اُن پر غور و تعمق کی نظر ڈالی جاوے - اور اُن کے سیاق و سباق کو مدنظر رکھا جاوے - تو اُن سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے - کہ یہ آیتیں شرائع سابقہ انبیاء کے بعض احکام کے تبدیل ہونے سے تعلق رکھتی ہیں - نہ قرآن مجید کی آیتوں کے باہم ناسخ و منسوخ ہونے سے - اور ہم امید کرتے ہیں کہ جن بزرگوں کے پاس ہماری تفسیر کی پہلی جلد موجود ہے وہ اس بیان کو اُس صفحہ کے حاشیہ پر درج فرمائینگے - جہاں ہم نے ناسخ و منسوخ پر بحث کی ہے +

قرآن مجید کی قسمیں

لوگ تعجب کرتے ہیں۔ کہ خدا تعالےٰ نے قرآن مجید میں اتنی قسمیں کیوں کھائیں۔ مگر اس شبہ کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے۔ کہ انہوں نے قرآن مجید کے طرز کلام پر غور نہیں کیا +

اوّل یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن مجید بلاشبہ خدا کا کلام ہے۔ مگر وہ انسانوں کی زبان اور محاورہ میں نازل ہوا ہے۔ اور اُس کا طرز کلام بعینہٖ ایسا ہے۔ جیسے کہ ایک نہایت فصیح شخص عربی زبان میں کلام کرتا ہو اور اُس کی فصاحت بے مثل ہو +

جس طرح کہ انسان کی زبانوں میں استعارہ اور کنایہ اور مجاز اور حقیقت پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کلام اللہ میں بھی موجود ہے۔ یہاں تک کہ عربی زبان میں غیر قوموں کے جو الفاظ شامل ہو گئے تھے وہ بھی قرآن مجید میں ہیں۔ زمانۂ نبوت میں جو طرز کلام عرب میں تھا اور جس طرح کہ وہ بات چیت کرتے تھے۔ یا اپنے کلام کے استحکام اور اس کے سچ ہونے پر زور دیتے تھے۔ اور جس قدر الفاظ غیر قوموں کے اُن کی زبان میں مل گئے تھے۔ اُسی طرز کلام پر قرآن مجید نازل ہوا ہے +

مثلاً لفظ سرادق جو قرآن میں ہے عربی کا لفظ نہیں ہے۔ بلکہ لفظ سراپردہ جو فارسی زبان کا ہے۔ اس کو معرب کر کے سرادق کر لیا ہے +

ابریق کا لفظ بھی قرآن مجید میں موجود ہے حالانکہ وہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ بلکہ فارسی لفظ آبریز کو معرب کر کے ابریق بنا لیا ہے +

استبرق کا لفظ بھی قرآن مجید میں ہے۔ وہ بھی عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ بلکہ فارسی زبان کے لفظ استبرہ سے معرب کیا گیا ہے +

کنز کا لفظ بھی قرآن مجید میں ہے۔ اور وہ بھی عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ بلکہ فارسی لفظ گنج سے معرب ہوا ہے +

فردوس کا لفظ بھی قرآن مجید میں موجود ہے جو عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ آرین خاندان کی زبانوں سے لیا گیا ہے۔ اور جو سنسکرت میں پردیش ہے جس کے معنی اجنبی ملک کے ہیں۔ یہی لفظ جس کی شکل انگریزی زبان میں پیراڈائز ہو گئی ہے +

اسی طرح بہت سے لفظ قرآن مجید میں ہیں جو عربی زبان کے لفظ نہیں ہیں۔ بلکہ عبرانی۔ سریانی۔ قبطی۔ فارسی۔ لاطینی اور یونانی زبانوں سے معرب ہو کر عربی زبان میں شامل ہو گئے ہیں۔ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "اتقان فی علوم القرآن" میں ایک مستقل باب

ان الفاظ کے لئے باندھا ہے۔ جو غیر زبانوں سے معرب ہوکر عربی زبان میں شامل ہو گئے ہیں اور قرآن مجید میں موجود ہیں +

غرضکہ قرآن مجید ایسی زبان میں نازل ہوا ہے جو اُس زمانہ کے اہل عرب کی زبان تھی +

طرز کلام قرآن مجید کا بھی اُسی زمانہ کے طرز کلام پر ہے۔ اُس زمانہ میں کاہنوں کی جو عرب میں مقدس گنے جاتے تھے۔ یہ عادت تھی کہ عموماً فصیح کلام کرتے تھے اور اکثر مقفّی کلام بولتے تھے اور قسموں کا استعمال بھی کرتے تھے۔ اور جس بات کو وہ بطور کہانت یعنی اِخبار بالغیب کے سچ سمجھتے تھے۔ اور دوسروں کو اس کے سچ ہونے کا یقین دلانا چاہتے تھے۔ اس کو قسموں کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اسی طرز کلام پر جو عربوں کو عام طور پر مرغوب اور دل پسند تھا۔ اور جو نہایت فصیح طرز کلام سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ اور اُس میں بھی جن باتوں کا یقین دلانا منظور ہے اُن کو قسموں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اُسی طرز کلام کے سبب سے عرب کے لوگ آنحضرت کو کاہن خیال کرتے تھے۔ جس کی قرآن مجید میں تردید کی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے۔ "فلا اقسم بما تبصرون ۝ وما لا تبصرون ۝ انّہٗ لقول رسول کریم ۝ وما ھو بقول شاعر قلیلا ما تومنون ولا بقول کاھن قلیلا ما تذکرون ۝ تنزیل من رب العلمین" یعنی جو چیز تم کو دکھائی دیتی ہے اور جو نہیں دکھائی دیتی۔ ہم کو اُس کی قسم ہے کہ یہ قرآن مجید ایک بڑے پیغمبر کا کلام ہے۔ اور کسی شاعر کا کلام نہیں ہے مگر تم بہت کم یقین کرتے ہو۔ اور نہ وہ کسی کاہن کا قول ہے۔ مگر تم بہت کم غور کرتے ہو۔ یہ پروردگار عالم کی طرف سے نازل ہوا ہے (الحاقہ۔ ۳۸۔۴۳)

اس تردید کو بھی خدا نے قسم ہی کے ساتھ بیان کیا ہے اور قسم بھی ایسی جو انہی کی سمجھ کے موافق تھی۔ دوسری جگہ خدا نے خود پیغمبر سے خطاب کرکے فرمایا ہے "فذکّر فما انت بنعمة ربّک بکاھن ولا مجنون" یعنی اے پیغمبر تو نصیحت کئے جا خدا کے فضل سے نہ تو کاہن ہے نہ مجنون ہے (طور۔ ۲۹) +

زمانہ جاہلیّت کا کلام ہم تک بہت کم پہنچا ہے۔ مگر ابن اثیر نے اپنی کتاب کامل میں قبیلہ بنی خزاعہ کے ایک کاہن کا قول ہاشم کی فضیلت اور امیّہ کے منقصت میں نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کس قدر قسمیں کھائی ہیں اور وہ قول یہ ہے۔ "والقمر الباھر والکوکب الزاھر والغمام الماطر وما بالجو من طائر وما اھتدیٰ بعلم مسافر من منجد و غائر لقد سبق ھاشم امیہ فی المآثر اول منہ واخر وابو ھمھمہ بذلک خابر" یعنی قسم ہے روشن چاند کی قسم ہے روشن ستاروں کی قسم ہے برستے بادلوں کی قسم ہے

آسمان میں اڑنے والے پرندوں کی قسم ہے اونچے اونچے راستوں میں چلنے والے مسافروں کے نشانوں سے ہدایت پانے کی کہ ہاشم امیّہ پر اگلی اور پچھلی نیکیوں میں سبقت لے گیا ہے۔ اور ابوہمہ کو اس بات کی خبر ہے (کامل ابن اثیر مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۸) ٭

اسی طرح قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا" یعنی قسم ہے سورج کی اور اُس کی دھوپ کی۔ قسم ہے چاند کی جب وہ سورج کے پیچھے نکلتا ہے۔ قسم ہے دن کی جب کہ سورج اُس کو روشن کرتا ہے۔ قسم ہے رات کی جب کہ وہ سورج کو چھپا لیتی ہے قسم ہے آسمان کی اور اُس کے بنانے والے کی قسم ہے زمین کی اور اُس کے بنانے والے کی ٭

پس یہ قسمیں اسی طرز کلام پر واقع ہوئی ہیں۔ جو عرب کا طرز کلام تھا۔ ہاں اس طرح قسمیں کھانے پر اس بات کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہرگاہ خدا کے سوا اور کسی کی قسم کھانی منع کی گئی ہے۔ تو خود خدا نے غیر خدا کی قسمیں کیوں کھائی ہیں۔ مگر غیر خدا کی قسمیں کھانے کا امتناع اس سبب سے ہے۔ کہ غیر خدا کی قسمیں کھانے سے اُس میں شان الوہیت کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ مگر جب کہ تسلیم کر لیا جاوے جیسا کہ قرآن مجید میں جا بجا بتایا گیا ہے کہ تمام چیزیں مخلوق ہیں۔ اور خدا ان سب کا خالق ہے۔ تو خدا اگر اپنی مخلوق کی قسم کھاوے تو کسی طرح شائبہ الوہیت اُس مخلوق میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور اگر کچھ سمجھا جاتا ہے تو اسی قدر سمجھا جاتا ہے کہ وہ چیزیں اپنی خلقت میں یا انسان کے لئے مفید ہونے میں عظیم الشان اور عظیم القدر ہیں۔ لیکن اگر انسان ان میں سے کسی کی قسم کھاوے خصوصاً ایسی چیزوں کی جن کو مشرکین پوجتے تھے تو اُن میں شائبہ الوہیت کے ماننے کا شبہ جاتا ہے۔ اور اس لئے انسانوں کو غیر خدا کی قسم کھانا منع کیا گیا ہے ٭

عرب کے لوگوں میں جو یہ عادت تھی کہ باتوں میں بہت سی قسمیں کھایا کرتے تھے اور بعضے ایسے تھے کہ قسم کھانا اُن کا تکیہ کلام ہو گیا تھا۔ اور ہر بات پر "لا واللہ۔ بلیٰ واللہ" بطور تائید کے و توثیق اپنی کلام کے کہا کرتے تھے اور اُن کو ہرگز یہ خیال نہیں ہوتا تھا۔ کہ ہم نے کوئی قسم کھائی ہے۔ اسی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے "لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم" یعنی تمہاری قسموں میں جو لغو قسمیں ہیں۔ اُن پر خدا تم سے مواخذہ نہیں کرنے کا۔ لیکن جو قسمیں تم نے دل کے ارادے سے کھائی ہیں۔ اُن پر مواخذہ کریگا ٭

دوسری آیت میں "بما کسبت قلوبکم" کی جگہ "بما عقدتم الایمان" ہے۔ اُس کے معنی بھی یہی ہیں۔ کہ خدا اُنہی قسموں پر پکڑیگا جن کو تم نے سمجھ بوجھ کر پختہ کیا ہے ٭

سورج کی گردش زمین کے گرد قرآن مجید سے ثابت نہیں

لوگوں کا یہ خیال کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نمرود کے سامنے یہ حجت پیش کرنی ۔ کہ "اِنَّ اللّٰہ یاتی بالشمس من المشرق فأت بِھا من المغرب" اس بات پر دلیل قطعی ہے کہ آفتاب زمین کے گرد پھرتا ہے ۔ تمام بزرگان قدیم کیا عوب عُربا ۔ اور کیا صحابہ کرام ۔ اور کیا علماے اسلام اسی پر یقین کرتے تھے ۔ پس یہ کہنا کہ آفتاب ساکن ہے ۔ اور زمین اپنے محور پر یومیہ ملیلیۃٍ کی حرکت کرتی تھی جس کے سبب دن رات اور طلوع وغروب ہوتا ہے قرآن مجید کے برخلاف ہے ◆

مگر ہمارے نزدیک ایسا کہنا خود قرآن مجید کا مطلب اور اُس کا طرز کلام نہ سمجھنے پر مبنی ہے ۔ قرآن مجید میں صرف یہ بیان ہے ۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ خدا سورج کو مشرق سے لاتا ہے ۔ پھر اگر تجھ میں کچھ طاقت ہے تو اُس کو مغرب سے لا ۔ اور یہ نہیں بتایا ۔ کہ کس طرح پر خدا اُس کو مشرق سے لاتا ہے ۔ خود اُس کی حرکت سے یا اور کسی چیز مثلاً زمین کی حرکت سے پس یہ کہنا ۔ کہ یہ آیت سورج کی گردش کی قطعی دلیل ہے محض غلط ہے ◆

اس بات پر عوب عُربا ۔ یا صحابہ کرام یا علماے اسلام یا تمام انسانوں کا یقین کرنا ۔ کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے ۔ اور مغرب کو جاتا ہے ۔ مشاہدہ پر مبنی ہے ۔ کیونکہ وہ اس طرح پر دیکھتے ہیں ۔ اس کی وجہ بیان کرنی پیغمبر کا کام نہیں تھا اور نہ اُن لوگوں کے لئے ضرور تھا جو اسی طرح پر سورج کا نکلنا اور غروب ہونا دیکھتے تھے ۔ بلکہ یہ کام علماے علم ہیئت کا کام تھا ۔ اور اُن علماء نے سورج کا زمین کے گرد پھرنا ۔ جیسا کہ وہ دیکھتے تھے ۔ بغیر تجربہ کے اور بغیر تحقیقات کافی کے غلطی سے قرار دیا تھا ۔ اور یہی امر تمام قدما کے دل میں خواہ وہ عرب عُربا ہوں یا صحابہ کرام اور علماے اسلام مستقر ہو گیا تھا ۔ مگر اب تحقیقات علوم جدیدہ سے اس امر کی غلطی ثابت ہوئی ہے ◆

اصلی مقصود اس آیت کا خدا کی کامل قدرت اور خدا کی بے انتہا عظمت کا ثابت کرنا ہے ۔ نہ سورج کے اس طرح پر دکھائی دینے کے سبب کا ۔ پس اگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور علماے اسلام نے اس کا سبب غلط سمجھا ۔ خواہ اپنے اجتہاد سے ۔ خواہ مشاہدہ سے ۔ جیسا کہ اُن کو دکھائی دیتا تھا ۔ تو اُن کی بزرگی اور تقدس میں کوئی نقص لازم نہیں آتا ۔ کیونکہ وہ خدا کے بندے اور خدا کی عبادت کرنے والے تھے ۔ نہ علم ہیئت کے دقیق مسائل کو حل کرنیوالے

اور جو مقصود اس آیت کا تھا۔ اُس غلط فہمی سے اُس میں کچھ نقصان نہیں آتا ہے۔ اور ہمارے نزدیک یہی بڑا معجزہ قرآن مجید کا ہے۔ کہ جاہل اور عالم دونوں کی برابر ہدایت کرتا ہے۔ جو ہدایت کہ قرآن مجید کا مقصود ہے +

سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن مجید کو اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلّم کو اُن امور سے جو لوگوں کے دل میں منقش تھے یا اُن رسوم سے جو ایام جاہلیّت میں مروج تھیں۔ بشرطیکہ مخالف اُس مقصد کے نہ ہوں۔ جس کے لئے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تھے۔ کچھ بحث یا تعرض نہیں تھا۔ اور اسی لئے اُسی طرح اُن کو چھوڑ دیا جس طرح پر کہ وہ تھے۔ اور قرآن مجید میں بطور نقل یا بطور مسلمات ان لوگوں کے (جن کو فہمائش کی جاتی ہے۔ اور جس پر حجت الزامی کی بنا قائم ہوتی ہے) بیان کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ اُن امور کی حقیقت بھی اس طرح پر ہے جس طرح پر کہ وہ نقل کی گئی ہے + اس قسم کے امور سے بحث نہ کرنا۔ نہایت مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اُن امور سے بحث بھی کیجاوے تو لوگ ایک نئی بحث اور فکر میں پڑ جاوینگے۔ اور جس امر کی ہدایت اصلی مقصود ہے۔ وہ ضائع ہو جاویگی۔ مثلاً اسی مقام پر جو حضرت ابراہیم نے اپنی حجت میں بیان کیا۔ "اِنّ اللہ یاتی بالشمس من المشرق فأت بھا من المغرب۔" اگر اس کے عوض اس طرح وہ بیان کرتے کہ "اِنّ اللہ یدور الارض من المغرب الی المشرق۔ فدور الارض من المشرق الی المغرب" تو کوئی شخص اس کا مطلب نہ سمجھتا۔ بلکہ سب لوگ حیران ہو جاتے۔ کہ زمین کے پھرنے کے کیا معنی ہیں۔ اور اگر زمین پھرتی ہے۔ تو ہم ٹیڑھے کیوں نہیں ہو جاتے۔ اور اُس کا پھرنا ہم کو معلوم کیوں نہیں ہوتا۔ اور جب ہم اس کے نیچے جاتے ہیں۔ تو گر کیوں نہیں پڑتے +

اوّل تو یہ سب اُمور جب تک کہ علم رفتہ رفتہ اعلےٰ ترقی پر نہ پُہنچے معلوم بھی نہیں ہو سکتے۔ اور پھر اُن کا سمجھانا نہایت ہی مشکل پڑتا ہے۔ باوجودیکہ علوم اس زمانہ میں ایسی ترقی پر پُہنچ گئے ہیں۔ بہُت سے لوگ ایسے ہیں کہ اب بھی اُن امور کے سمجھنے میں۔ اُن کی عقل عاجز ہے۔ پس قرآن اور پیغمبر خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ان جھگڑوں میں پڑنا۔ اُس مقصود کا برباد کر دینا تھا۔ جس کے لئے آنحضرت صلّے اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تھے۔ اور اس لئے ضرور تھا۔ کہ جو مسلمات اور رسومات ایسی ہیں۔ جن سے اُس اصلی مقصود ہدایت میں کچھ نقصان لازم نہیں آتا۔ ان کو نہ چھیڑا جاوے اور خلق موجودات کے باریک باریک نکتوں کے سمجھانے پر متوجہ ہونا۔ جس کو ترقی علم اپنے وقت پر بخوبی سمجھا سکتی تھی محض غیر ضروری تھا +

ہم بھی کبھی اسی رنگ میں تھے

ہمارے پاس جناب فرخندہ علی صاحب نے مقام حیدرآباد سے ایک تحریر بھیجی ہے جو اُس تحریر کا جواب ہے۔ جو جناب شمس العلما شیخ محمود گیلانی نے اس باب میں تحریر فرمائی ہے۔ کہ قرآن مجید کی بعض آیتوں سے زمین کا متحرک ہونا پایا جاتا ہے +

جناب سید فرخندہ علی صاحب قرآن مجید کی بعض آیات کے استدلال سے زمین کا ساکن ہونا۔ اور آفتاب کا زمین کے گرد متحرک ہونا ثابت فرماتے ہیں۔ اس پر کہتے ہیں۔ کہ ہم بھی کبھی اسی رنگ میں تھے۔ بہت مدت ہوئی کہ ہم نے ایک رسالہ لکھا تھا جس کا نام ہے "قول متین فی ابطال حرکت زمین" اور فخر کرتے تھے کہ نہایت خوبی سے ہم نے حرکت زمین کا ابطال کیا ہے۔ مگر جب غور کیا تو سمجھے۔ کہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اس وقت ہم کو ان دونو بزرگوں کے دلائل پر جرح وقدح منظور نہیں ہے۔ بلکہ صرف ہم کو یہ کہنا ہے۔ کہ قرآن مجید سے نہ زمین کا متحرک ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔ نہ زمین کا ساکن ہونا۔ اسی طرح نہ آفتاب کا متحرک ہونا ثابت ہو سکتا ہے اور نہ ساکن ہونا۔ اور نہ قرآن مجید کو اس مسئلہ دقیق ریاضی سے بحث کرنی مقصود تھی۔ کیونکہ ترقی علوم خود اس امر کا تصفیہ کرنے والی تھی۔ اور قرآن مجید کا مقصد اس سے زیادہ اعلےٰ اور افضل تھا۔ اور ہرگز مصلحت نہ تھی کہ خدا ایسے باریک مسئلہ کو ان بدؤں اونٹوں کے چرانے والوں کے سامنے یا اُن عالموں کے سامنے جن کے علم و تجربہ نے کافی ترقی نہیں کی تھی۔ بیان کرکے لوگوں کو پریشانی میں ڈالتا۔ اور تعلیم اخلاق کو جو اصلی مقصد مذہب کا تھا۔ اس دقیق مسائل میں ڈال کر برباد کر دیتا۔ بایں ہمہ ہمارا یقین کامل ہے کہ ورک[1] آف گاڈ اور ورڈ[2] آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتے۔ گو ہم نے اپنے نقص علم سے کبھی ورڈ کے معنی غلط سمجھے ہوں۔ ایک دوست نے ہم سے کہا۔ کہ سورج کی گردش اُس کے محور پر قرآن مجید سے ثابت ہے اور یہ آیت پڑھی۔ والشمس تجری لمستقر لھا ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ پس لفظ مستقر لھا سے اس کی حرکت محوری ثابت ہے کہ اپنی جگہ پر بھی ہے اور حرکت بھی کرتا ہے۔ ہم نے کہا کہ آپ کی جودت ذہن خدا مبارک کرے۔ مگر خدا کو ان مسائل علم ہیئات سے بحث نہیں ہے۔ وہ اُن امور کو اسی طرح بیان کرتا ہے جس طرح کہ لوگ اُن کو دیکھتے ہیں۔ اور اگر آپ کو بھی یہ مسئلہ حرکت شمس کا اپنے محور کے گرد علوم جدیدہ سے معلوم نہ ہوتا۔ تو آپ بھی یہ معنی جو فرماتے ہیں نہ فرماتے +

---

[1] فعل خدا ۱۲ [2] قول خدا (احمد بابا مخدومی) ۱۲

سبع ارضین

یعنی سات زمینیں۔ قال اللہ تعالےٰ۔ اللہ الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلھن یعنی اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا۔ سات آسمانوں کو۔ اور زمینوں کو مثل اُن کے +

اِس آیت میں یہ بحث ہے۔ کہ مثلھن سے زمین کو آسمانوں سے کس چیز میں مماثلت ہے +

ہمارا قول تو یہ ہے کہ اس آیت میں زمین کو آسمانوں سے مماثلت فی الخلق مقصود ہے۔ یعنی جس طرح خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ اُسی طرح سے اپنی قدرت کاملہ سے زمین کو پیدا کیا ہے +

اس آیت میں ارض مفرد آیا ہے۔ بلکہ تمام قرآن مجید میں کسی جگہ ارض بصیغہ جمع یعنی ارضین نہیں آیا۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ جب ارض پر کسی حیثیت سے جمع کا اطلاق نہیں ہوا۔ تو تعدد ارض نہیں پایا جاتا۔ والارض میں جو واو ہے اُس کا عطف سموات پر ہے یعنی خلق الارض مثل خلق السموات بکمال قدرتہ وارادتہ۔ مگر علمائے مفسّرین نے یہ معنی اختیار نہیں کئے۔ انہوں نے مثل سے مماثلت فی العدد مراد لی ہے۔ اُن علمار کے بھی دو فرقے ہیں +

ایک فرقہ وہ ہے۔ جو زمین کو تو ایک ہی مانتا ہے۔ مگر اُس مماثلت کو طبقات ارض کی مماثلت پر محدود رکھتا ہے۔ یعنی اُس کا مقصود یہ ہے۔ کہ جس طرح آسمان کے طبقے ہیں۔ اُسی طرح زمین کے بھی طبقے ہیں +

تفسیر کبیر میں کلبی کا قول لکھا ہے۔ کہ جس طرح آسمان کے اوپر آسمان پیدا کئے ہیں۔ اُسی طرح زمین کے طبقے بھی پیدا کئے ہیں۔ ایک طبقہ تو اس کا خالص مٹی کا ہے۔ اور ایک طبقہ گیلی مٹی کا۔ اور ایک کھُلا ہوا طبقہ ہے جس پر دریا اور جنگل ہیں۔ اور ہم لوگ رہتے ہیں +

بعض عالموں نے خیال کیا ہے کہ اس آیت میں سبع سموات کا لفظ ہے۔ اور ایک جگہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ کہ "سبع سموات طباقاً" پس مثلھن سے زمین کے بھی سات طبقے قرار دینا ضرور ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے زمین کی سات اقلیموں کو زمین کے سات طبقے قرار دیئے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ کچھ عجب نہیں کہ مثلھن سے سات اقلیمیں مراد ہوں مطابق سات آسمانوں کے جن میں سات ستارے ہیں +

بخاری کی اُن حدیثوں میں جو حضرت عائشہؓ اور سعید بن زید سے مروی ہیں۔ کہ جو کسی کی بالشت بھر زمین غصب کریگا۔ اُس کو خدا تعالےٰ قیامت میں سات زمینوں کا طوق پہناویگا۔ اور جو حدیث سالم کے باپ یعنی عبداللہ ابن عمر سے بخاری میں مروی ہے کہ غصب کرنے والا کسی کی زمین کا قیامت میں ساتویں زمین تک دھسایا جاویگا +

ان حدیثوں میں علمانے سات زمینوں سے سات طبقے زمین کے مراد لئے ہیں چنانچہ فتح الباری میں علامہ ابن حجرنے داؤدی کا قول نقل کیا ہے۔ کہ آسمان کی طرح زمین کے بھی سات طبقے ہیں۔ اور وہ طبقے بلافصل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اور جس عذاب کا ان حدیثوں میں ذکر ہے۔ اگرچہ فتح الباری میں اس کی تصریح لکھی ہے۔ مگر ہم کو اس مقام پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں +

غرضکہ قرآن مجید میں تو مماثلت کی کچھ تصریح نہیں ہے کہ زمین کو آسمانوں سے کس چیز میں مماثلت ہے۔ بلکہ جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ صرف علماء کی رائے اور اُس کا اجتہاد ہے جس میں ہم کو کوئی مقام عذر نہیں ہے +

امام فخرالدین رازی نے بھی تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔ کہ یہ تفسیریں ایسی ہیں۔ جن سے عقل انکار نہیں کرتی۔ اور اُن کے سوا جو اور تفسیریں مفسرین نے نقل کی ہیں۔ وہ ایسی ہیں۔ جن کو عقل قبول نہیں کرتی +

پس بعض علماء نے جو بربنا بعض روایتوں کے مثلھن سے مماثلت فی العدد تصور کر کے یہ قرار دیا ہے کہ سات جداگانہ زمینیں ہیں ہم اس رائے کو اور اُن حدیثوں کو نہیں مانتے جیسا کہ ہم آگے بیان کرینگے +

ترمذی میں سورۃ الحدید کی تفسیر میں ایک بہت بڑی حدیث لکھی ہے۔ اور سات زمین ہونے کے متعلق جو فقرہ اُس میں لکھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ" رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا۔ کہ تمہارے نیچے کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خدا اور رسول جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زمین ہے۔ پھر پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ اس کے نیچے کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ خدا و رسول جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے نیچے ایک دوسری زمین ہے۔ اور ان دونوں میں پانچسو برس کے رستہ کا فاصلہ ہے اسی طرح سات زمینوں کو گِنا۔ کہ ہر زمین میں پانسو برس کے رستہ کا فاصلہ ہے پھر آپ نے فرمایا کہ قسم ہے۔ اُس شخص کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر تم ایک رسی نیچے زمین تک لٹکاؤ تو خدا پر جا پہنچیگی۔ پھر آپ نے پڑھی۔ یہ آیت۔ ھو الاول والاٰخر والظاھر والباطن وھو بکل شئ علیم +

خود ترمذی میں لکھا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ کیونکہ حسن بصریؒ نے ابوہریرہ سے روایت

کی ہے اور حسن بصری کا سماع ابوہریرہ سے ثابت نہیں +

میزان الاعتدال میں علامہ ذہبی نے لکھا ہے۔ کہ حسن بصری روایتوں کے بیان کرنے میں تدلیس بہت کرتے تھے۔ یعنی اس راوی کا نام لے دیتے تھے۔ جس سے اُنہوں نے حدیث نہیں سُنی۔ اس لئے جب کبھی وہ عن کے لفظ سے کسی صحابی سے حدیث بیان کرتے ہیں (جیسے کہ اُس حدیث میں عن ابوہریرہ کرکے بیان کیا ہے) تو محدثین کے نزدیک اُس حدیث سے استدلال کرنا نہایت ضعیف ہوجاتا ہے۔ خصوصاً جب وہ ایسے شخص سے روایت کریں۔ جس کی نسبت محدثین نے تصریح کردی ہے۔ کہ حسن بصری نے اس سے حدیث نہیں سنی۔ اور انہیں میں سے ایک ابوہریرہ ہیں۔ تو اُن کی روایت ساقط الاعتبار ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ جو راوی تدلیس کرتا ہو۔ اُس کی مُعنعن روایت مقبول اور قابل احتجاج نہیں ہے پس یہ حدیث خود محدثین کے اصول کے مطابق قابل اعتبار نہیں ہے +

اور مسند امام احمد بن حنبل میں بھی حدیث باختلاف الفاظ قلیل آئی ہے۔ اُس میں بھی حسن بصری نے بالفاظ عن ابی ہریرہ روایت کی ہے۔ اور اس لئے یہ بھی مثل حدیث ترمذی کے قابل سند کے نہیں ہے +

ایک حدیث مستدرک حاکم میں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے: ایک زمین سے دوسری زمین تک جو اس کے متصل ہے پانچ سو برس کا راستہ ہے +

اوپر والی زمین ایک مچھلی کی پشت پر ہے۔ جس کے دونو کنارے آسمان دنیا سے ملتے ہیں۔ مچھلی ایک پتھر کی چٹان پر ہے۔ پتھر کی چٹان ایک فرشتہ کے ہاتھ پر ہے۔ دوسری زمین وہ ہے۔ جہاں ہوا بند رہتی ہے۔ جب خدا نے قوم عاد کو ہلاک کرنا چاہا۔ تو ہوا کے موکل کو حکم دیا کہ اُن پر ہوا بھیجے۔ جس سے وہ ہلاک ہوجائیں۔ موکل نے پوچھا۔ کہ میں اتنی ہوا بھیجوں جتنی کہ بیل کے نتھنے میں سے نکل سکتی ہے۔ خدا نے فرمایا۔ نہیں۔ کیونکہ زمین اور اس کے رہنے والے سب ہلاک ہوجائینگے۔ تو اُن پر اتنی ہوا بھیج دے۔ جتنی کہ انگوٹھی کے حلقے میں سے نکل سکتی ہے اسی کی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے۔ جہاں فرمایا ہے۔ کہ وہ ہوا جہاں سے گذرتی تھی۔ بوسیدہ ہڈی کی طرح چورہ کئے بغیر نہیں چھوڑتی تھی۔ تیسری زمین وہ ہے۔ جہاں دوزخ کے پتھر ہیں۔ چوتھی زمین وہ ہے جہاں دوزخ کی گندھک ہے۔ لوگوں نے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ دوزخ میں گندھک بھی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ دوزخ میں گندھک کے دریا ہیں۔ کہ اگر سنگلاخ پہاڑوں پر چھوڑ دیئے جاویں۔ تو وہ پگل کر رہ جاویں۔ پانچویں زمین وہ ہے۔ جہاں دوزخ کے سانپ ہیں۔ جن کے منہ دریا کی وادی

کی طرح فراخ ہیں۔ وہ کافروں کو ڈسیں گے۔ اور ان کی ہڈی پر گوشت نہ چھوڑینگے چھٹی زمین وہ ہے
جہاں دوزخ کے بچھو ہیں جن میں سے اونٹے بچھو خچروں کے برابر ہیں۔ وہ کافروں کے بدن پر
ڈنگ مارینگے جس کی تکلیف سے وہ دوزخ کی آنچ کی تکلیف بھول جائینگے۔ ساتویں زمین
کا نام سقر ہے جہاں شیطان لوہے کے زنجیروں میں قید ہے۔ ایک ہاتھ آگے اور
ایک ہاتھ پیچھے۔ جب خدا اپنے بندوں میں سے کسی پر اس کو بھیجنا چاہتا ہے۔ تو اس کو
چھوڑ دیتا ہے +

مستدرک حاکم ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ حدیث ہم نے منتخب کنزالعمال سے نقل کی ہے
اس کے آخر میں لکھا ہے۔ وتعقب عن ابن عمر یعنی اس روایت کو عبداللہ ابن عمر سے بیان کیا ہے
لیکن مستدرک میں حاکم نے پہلی دفعہ اس حدیث کو جس طریقہ سے بیان کیا ہے۔ اس کے اخیر راوی کا
نام نہیں لیا۔ پس اس کے راوی دونوں طریقہ سے کوئی ہوں۔ ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ اور اس لئے اس
حدیث کے سلسلہ روایت پر کوئی بحث روایتاً نہیں ہوسکتی۔ درایتاً ہم اس روایت پر عنقریب
بحث کرینگے +

یہاں تک تو ہم نے ان حدیثوں کی نامعتبری بلحاظ راویوں کے بیان کی ہے۔ لیکن ہمارے
نزدیک اور علمائے محققین کے نزدیک بھی۔ سب سے بڑا اصول حدیثوں کے معتبر یا نامعتبر
قرار دینے کا درایت ہے جس سے نفس حدیث کے مضمون پر جانچ کی جاتی ہے۔ اگر مضمون
حدیث کا ایسا ہو جس کی صحت تسلیم نہ ہوسکے۔ تو بلا لحاظ اس بات کے کہ اُس کے راوی معتبر ہیں
یا نامعتبر وہ حدیث نامعتبر قرار پاویگی۔ مثلاً کوئی حدیث ایسی ہو جس میں تاریخ مشہور کے خلاف
کوئی بات بیان کی گئی ہو۔ یا یہ کہ جو کچھ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ مخالف مقتضائے عقل ہو
یا ایسا امر بیان کیا گیا ہو جس کو حس اور مشاہدہ غلط قرار دیتا ہو۔ یا خود حدیث کے الفاظ یا اُس کے
معنوں میں رکاکت اور سخافت ہو تو ایسی حدیثیں باعتبار درایت کے نامعتبر قرار دی جاوینگی
چنانچہ یہ سب باتیں اور مثل اس کے اور بہت سی شاہ عبدالعزیز صاحب عجالہ نافعہ میں اور امام
سخاوی نے فتح المغیث میں اور سیوطی نے تدریب الراوی میں لکھی ہیں +

اب اوّل تو ان حدیثوں میں جو سات زمینوں کے ہونے کا بیان ہے۔ وہ خود غلط ہے۔
اس لئے کہ سات زمینوں کا وجود دنیا میں نہیں ہے۔ اور علم ہیئت سے خواہ وہ قدیم ہو یا جدید
زمین کے تلے اور متعدد زمینوں کا ہونا ثابت نہیں +

دوسرے ان حدیثوں کے مضمون ایسے رکیک اور سخیف ہیں کہ کسی طرح جناب رسول خدا صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں ہوسکتے۔ کیا کوئی شخص اس مضمون کو جو ترمذی اور مسند امام احمد حنبل

کی حدیث میں سخیف نہیں قرار دیتا۔ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر کہا۔ کہ اگر تم ایک رسی نیچے کی زمین تک لٹکاؤ تو خدا پر جا پہنچیگی " علاوہ اس کے اُن حدیثوں میں اور بہت سی رکیک باتیں ہیں۔ جن کو ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وہ زمین کے متعدد ہونے سے متعلق نہیں تھیں +

مستدرک حاکم میں جو حدیث ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ پہلی زمین ایک مچھلی کی پشت پر ہے جس کے دونوں کنارے آسمان دنیا سے ملتے ہیں۔ اول تو یہی غلط ہے۔ کجا زمین کے کنارے اور کجا آسمان۔ اُن میں تو زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ پھر لکھا ہے۔ کہ مچھلی ایک پتھر پر ہے۔ اور پتھر فرشتہ کے ہاتھ پر ہے +

دوسری زمین کی نسبت لکھا ہے۔ کہ اُس میں ہوا بند رہتی ہے۔ اور جب قوم عاد پر عذاب آیا تھا۔ تو فرشتہ نے پوچھا۔ کہ میں اُن پر اس قدر ہوا بھیجوں جس قدر بیل کی ناک میں سے نکل سکتی ہے۔ خدا نے کہا نہیں نہیں یہ تو بہت ہے اتنی بھیج جتنی کہ انگوٹھی کے حلقہ میں سے نکل سکے +

تیسری زمین میں دوزخ کے پتھر ہیں۔ اور چوتھی زمین میں گندھک کے دریا ہیں جو دوزخ میں ہونگے۔ پانچویں زمین میں دوزخ کے سانپ رہتے ہیں۔ اور چھٹی زمین میں دوزخ کے بچھو رہتے ہیں۔ اور ساتویں زمین میں شیطان لوہے کے زنجیروں میں جکڑا ہوا قید ہے۔ ایک ہاتھ اس کا آگے ہے۔ اور ایک ہاتھ پیچھے۔ ان سے زیادہ اور رکیک اور سخیف الفاظ اور معانی نہیں ہو سکتے اور نہایت افسوس اور ہزار افسوس اُن لوگوں پر ہے۔ جو ایسے رکیک اور سخیف الفاظ کو جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وَاَنَا اَشْهَدُ بِاللّٰهِ اِنَّ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ +

اصل یہ ہے کہ زمینوں کا متعدد ہونا۔ نہ عرب جاہلیت کے خیال میں تھا۔ نہ عیسائیوں اور یہودیوں کے۔ نہ آتش پرستوں کے اور نہ اُن سے پہلے کلدانی۔ عبرانی۔ لاطینی دیونانی قوموں میں تھا۔ شاید ہندؤں میں ہو۔ مگر صرف قرآن کی اُس آیت سے جو اوپر لکھی گئی ہے۔ اور اس میں جو لفظ مِثْلَهُنَّ ہے۔ اُس پر یہ تمام حدیثیں وضع کی گئی ہیں۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ بَرِیْٓءٌ عَنْ هٰذَا +

اور اُن حدیثوں سے بھی عجیب تر وہ روایت ہے۔ جو علامہ ابن حجر نے اپنی کتاب فتح الباری میں نقل کی ہے۔ یہ روایت جس کی طرف ہم اشارہ کرینگے۔ ابن جریر نے باسناد شعبہ عن عمرو بن مرہ عن ابی ضحی۔ عن ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں جس پر ہم بحث کرتے ہیں مختصر طور پر بیان کی ہے۔ اور حاکم اور امام بیہقی نے باسناد عطا بن السائب عن ابی ضحی مطول پر بیان کی ہے۔ اس روایت کے اول الفاظ یہ ہیں " وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ "

لے سبع ارضین فی کل ارض ادم کادمکم ونوح کنوحکم۔ وابراھیم کابراھیم کم۔ وعیسٰی کعیساکم۔ ونبی کنبیکم یعنی ومن الارض مثلھن" کے الفاظ سے سات زمینیں مراد ہیں۔ ہر ایک زمین میں ایک آدم ہے۔ جیساکہ تمہارا آدم ہے اور نوح ہے جیساکہ تمہارا نوح ہے۔ اور ابراہیم ہے جیساکہ تمہارا ابراہیم ہے۔ اور عیسٰے ہے جیساکہ تمہارا عیسٰے ہے۔ اور نبی ہے جیساکہ تمہارا نبی ہے +

اس روایت کو ابن عباس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا۔ ابن جریر اور امام بیہقی اور حاکم کی تصنیفات اس وقت ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ مگر فتح الباری میں جہاں اس روایت کے ابتدائی الفاظ لکھے ہیں۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم نے مجاہد کے واسطے سے خود ابن عباس سے روایت کی ہے کہ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے۔ اگر میں اس آیت کی تفسیر تم سے بیان کروں۔ تو تم کافر ہو جاؤ گے۔ اور تمہارے کافر ہونے کا سبب اس تفسیر کا جھٹلانا اور نہ ماننا ہوگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ مثلھن کی یہ تفسیر تھی جو اُن کے دل میں تھی۔ اور جس کو انہوں نے بیان کیا۔ نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا قول۔ اور جب کہ یہ اثر ابن عباس کا ہے۔ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے۔ تو اس پر احتجاج کرنا کچھ لازمی نہیں ہے +

اس اثر کی تائید قرآن مجید سے کسی طرح پر نہیں ہوتی۔ کیونکہ تمام قرآن میں ارضین کا لفظ بصیغہ جمع نہیں آیا۔ اور اس آیت میں بھی مفرد کا لفظ ہے۔ نہ جمع کا۔ علاوہ اس کے قرآن مجید کی کسی آیت سے نہیں پایا جاتا۔ کہ خدا نے سات آدم پیدا کئے تھے۔ اور سات نوح اور سات ابراہیم۔ اور سات عیسٰے اور سات نبی آخر الزمان +

پس صرف لفظ مثلھن سے سات زمینوں اور سات آدم اور سات ابراہیم اور سات عیسٰے اور سات نبی آخر الزمان کے ہونے پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ علاوہ اس کے یہ امر خلاف واقع بھی ہے۔ انہیں دلائل سے جو ہم نے حدیث ترمذی کی ذیل میں لکھی ہیں۔ اس روایت کے انکار کرنے سے کوئی کافر نہیں ہو سکتا +

اس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ یہ روایت شاذ ہے۔ اگر ہم فرض کریں کہ یہ روایت ایسی شاذ ہے کہ حضرت ابن عباس تک اُس کی صحیح سند موجود ہے۔ تو بھی بجز اس کے کہ حضرت ابن عباس کے ذہن میں اس آیت کی تفسیر میں یہ امور تھے۔ جو انہوں نے بیان کئے اور کچھ خیال نہیں کر سکتے۔ مگر جب کہ اس کی تائید نہ قرآن مجید سے ہوتی ہے۔ نہ وہ مطابق واقع معلوم ہوتی ہیں۔ تو درایتہً بھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ غرضکہ سات زمینوں کا جدا گانہ ہونا کسی طرح پر ثابت نہیں ہے +

مُکاشفہ

گو ہم کو کشف و مُکاشفہ نہ ہو۔ مگر ہم کو سمجھنا تو چاہئے۔ کہ یہ کیا چیز ہے؟ جاہل طب کو نہیں جانتا۔ مگر یہ جانتا ہے۔ کہ طب سے کیا ہوتا ہے۔ اور کیونکر ہوتا ہے پس اگر ہم بھی کشف و مکاشفہ سے جاہل ہیں۔ تو بھی ہم کو یہ سمجھنا چاہئے۔ کہ وہ ہے کیا چیز؟ حضراتِ صوفیہ کرام فرماتے ہیں۔ کہ روح اور جسم میں جو حجاب ہے۔ اُس کے اٹھ جانے کو مکاشفہ کہتے ہیں۔ مگر حجاب کے لفظ نے ہم کو گھبرا دیا کہ وہ پردہ کیسا ہے۔ جو روح اور جسم کے بیچ میں ہے۔ نہ وہ پردہ ٹاٹ کا ہو سکتا ہے۔ نہ کپڑے کا۔ نہ لنکاٹ۔ پھر وہ پردہ کاہے کا ہے؟

قرآن مجید میں ایک جگہ غِطاء کا لفظ آیا ہے جس کے معنی بھی حجاب کے ہیں۔ جہاں خدا نے فرمایا ہے۔ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ[ل] ہم نے جب تفسیروں کو دیکھا تو اُن میں غطاء کے معنی غفلت کے لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو پردہ انسان کے جسم اور روح کے درمیان میں ہے۔ وہ غفلت کا پردہ ہے۔ اور اس غفلت کا دور ہونا۔ پردہ کا اٹھ جانا ہے۔ پس انسان مشاغل دنیوی سے جو اُس پر پردہ غفلت ڈال دیتے ہیں علیحدہ ہو کر مبدء حقیقی یا ذاتِ باری کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اپنے خیال کو اسی طرف لگا لیتا ہے۔ تو غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔ پس مکاشفہ ایک حالت ہوئی۔ جو خود انسان کے خیال میں پیدا ہوتی ہے۔ پس جو کچھ کہ وہ اپنے نفس میں پاتا ہے۔ اور فرض کرو کہ وہ اس حالت میں کچھ دیکھتا بھی ہے۔ تو بجز اُس کے خیال کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ اور اس لئے مکاشفہ کی حقیقت بجز اس کے جس کو کہ خود انسان نے اپنے خیال میں پکایا ہے۔ اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔ اور اسی حالت کو صوفیہ کرام نے مکاشفہ نظری سے تعبیر کیا ہے۔
اور جب کہ اسی خیال کو اور زیادہ پکایا جاتا ہے۔ اور اُس کے تصور میں یہ خیال جم جاتا ہے۔ کہ میرا دل بھی نورانی ہو گیا ہے۔ تو اُس حالت کو صوفیہ کرام مکاشفہ نوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ بجز خیال انسانی کے۔ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے +

اور جب اس خیال کو اور زیادہ پکاتا ہے۔ اور سمجھتا ہے۔ کہ تمام اسرار آفرینش پر اُس کا ذہن محیط ہو گیا ہے۔ تو اُس کو صوفیہ کرام نے مکاشفہ سری سے یا مکاشفہ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ وہ بھی بجز اُن کے خیال کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے +

اور جب کہ اُس خیال کو دل میں اور زیادہ پکایا۔ اور سمجھنے لگا۔ کہ دوزخ اور بہشت کا حال

[ل] سورۂ قٓ آیت (احمد بابا مخدومی)

مجھ پر کھل گیا ہے اور فرشتے مجھ کو دکھائی دیتے ہیں۔ اور بے انتہا عالم مجھ پر کھل گئے ہیں۔ تو اس حالت کو صوفیہ کرام نے مکاشفہ روحانی سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ وہ بھی بجز اس کے خیال کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے +

اور جب کہ وہ اس خیال کو اور زیادہ پکا تا ہے۔ تو یہ سمجھتا ہے۔ کہ میں صفات باری میں بیٹھ گیا ہوں۔ تو صوفیہ کرام نے اُس حالت کو مکاشفہ صفاتی سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ وہ بھی بجز اس کے خیال کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے +

اگر یہ حالت انسان کی خدا کی صفت علمی میں بیٹھ جانے سے پیدا ہوئی ہو۔ تو اُس کو علم لدنی حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر خدا میں جو صفت سننے کی ہے۔ اُس میں وہ بیٹھ گیا ہو۔ تو وہ خدا کا کلام سُن سکتا ہے۔ جیسا کہ موسئے علیہ السلام سنتے تھے۔ اور اگر وہ خدا کے بصیر ہونے کی صفت میں بیٹھ گیا ہے۔ تو اُس کو خدا کا دیدار ہونے لگتا ہے۔ اور اگر وہ خدا کے جلال کی صفت میں بیٹھ جاتا ہے۔ تو اُس کو بقائے حقیقی حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر خدا کی صفت وحدانیت میں بیٹھ جاتا ہے۔ تو اُس کو وحدت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ خدا کی جس صفت میں بیٹھ جاتا ہے۔ اُسی کے موافق حالت اُس پر طاری ہوتی ہے۔ جس کو وہ مکاشفہ سمجھتا ہے۔ مگر وہ بجز اُس کے خیال کے اور کوئی چیز نہیں ہے +

اب صوفیہ کرام فرماتے ہیں کہ مکاشفہ ذاتی ایسی چیز ہے۔ جس کا بیان کسی طرح نہیں ہو سکتا۔
پس ان بیانات سے اس قدر سمجھ میں آتا ہے۔ کہ انسان جو کچھ اپنے خیالات میں پکا لیتا ہے اُسی کا نام مکاشفہ ہے۔ اور یہ حالتیں جو صوفیہ کرام نے بیان کی ہیں۔ سب خیال ہی خیال ہیں۔ اور خیال کے سوا کچھ نہیں۔ للہ در من قال "التصوّفُ هو ارجاع النفس الی امور خیالیة والمداومة علیها۔ الی زمانٍ حتی تتخیل الامور بخیاله کانّ هذا الامور موجودة فی نفسه۔ لٰکنّ الموجود فی خیاله هو خیالهُ۔ لا شیٌ غیرہ۔ هکذا یترقی من خیالٍ الی خیالٍ اٰخر۔ و یتصور شیٔ اٰخر۔ ولکنّهٗ لیس شیٌ اٰخرُ۔ اِلّا هو خیال نفسه فاذا ترقّٰی من الخیال الی شیٔ یتخیل انه هو اللّٰهُ۔ لو شاء من شیوته والان یتخیل انه رفع نفسه الی اعلی الدرجة۔ وعرف الله حق معرفته۔ واللّٰه بریٌ عن هذا۔ والحقُّ انّهٗ لیس کمثله شیٌ۔ وهو السمیع البصیر" +

واقعات عامۃ الوُرُود

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔جن کو اکثر ایک ہی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔مگر جو لوگ کہ اہل اللہ کہلاتے ہیں۔وہ اور اُن کے معتقدین اس کو کرشمۂ ربانی سمجھتے ہیں۔اور جو لوگ اہل دنیا کہلاتے ہیں۔وہ اُن کو واقعات اتفاقی سمجھ کر کچھ خیال نہیں کرتے +

شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک اپنا واقعہ لکھا ہے۔کہ ایک شخص ان سے ملنے آیا۔اور اُس وقت شاہ صاحب اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔حلوا کھا رہے تھے۔شاہ صاحب کے خادم نے اُس شخص کو بھی جو آیا تھا۔حلوا دیا۔اُس شخص کے دل میں یہ بات آئی کہ اگر شاہ صاحب وہ حلوا مجھ کو دیدیں۔جو اُن کے ہاتھ میں ہے۔تو میں ضرور یقین کروں گا۔کہ وہ اولیا اللہ میں سے ہیں۔اور میں اُن سے خدا کی راہ سیکھونگا۔شاہ صاحب کو بھی قرائن سے معلوم ہؤا۔کہ اُس شخص کے دل میں یہ بات گذری ہے۔اُن کو اپنی ولایت کا اظہار منظور نہ ہؤا۔اور جو خیال کہ اُس شخص کے دل میں گذرا تھا۔اور جس کو اُنہوں نے بھی جان لیا تھا اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔اور جو حلوا کہ اُن کے ہاتھ میں تھا۔اُس کو ایک لقمہ کر گئے +

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں۔کہ خدا نے مجھ سے مواخذہ کیا۔اور جو بے پروائی میں نے کی تھی۔وہ میرے مُنہ پر ماری۔میں نے اپنے اس فعل کی خدا سے معافی چاہی۔اور استغفار کی۔خدا نے مجھ کو معاف کر دیا +

اس میں کچھ شک نہیں۔کہ جب شاہ صاحب نے قرائن سے اس شخص کے دل کی خواہش کو دریافت کر لیا تھا۔اور اُس کو پورا نہ کیا۔تو آخر کو اُن کے دل میں اُس کا نہایت رنج وافسوس ہؤا ہوگا جس کو اس سبب سے کہ وہ اہل اللہ تھے۔اُنہوں نے خدا کی طرف سے مواخذہ سمجھا۔اور اُس سے توبہ اور استغفار کی۔اگر کوئی اہل دُنیا میں سے ہوتا۔اور اُس کو بھی ایسی حالت میں رنج وافسوس ہوتا۔تو وہ اُس کو خدا کے مواخذہ سے تعبیر نہ کرتا +

ایک واقعہ ہم پر قریب قریب اس کے گذرا ہے۔میں جب دہلی سے رہتک جانیوالا تھا۔حضرت شاہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں رخصت کے لئے حاضر ہؤا۔اُس وقت ایک عورت ایک نہایت تر و تازہ رنگترہ لائی۔اور شاہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔اُنہوں نے اُس کو لے کر رکھ لیا۔میرے دل میں یہ بات آئی۔کہ اگر شاہ صاحب یہ رنگترہ مجھ کو دیدیں۔تو میرے سفر کے لئے ایک فال نیک ہوگی۔جب

میں رخصت ہو کر جانے لگا۔ تو شاہ صاحب نے وہ زنگترہ اُٹھا کر مجھ کو دیا۔ کہ آپ اس کو لیتے جایئے۔ میں چونکہ ایک دنیادار تھا اور گو شاہ صاحب کی خدمت میں مجھ کو عقیدت تھی۔ اور ہے۔ مگر اُس کو ایک امر اتفاقی سمجھا۔ اور جو لوگ کہ مریدان خاص حضرت شاہ صاحب کے تھے۔ اُنہوں نے اس امر کو خطرات[1] قلب پر بطور مکاشفہ کے مطلع ہونا قرار دیا ✦

شاہ ولی اللہ صاحب اپنا دوسرا واقعہ لکھتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ ایک باوجاہت آدمی اُن سے ملنے کو آیا۔ اور وہ ایسا وقت تھا۔ کہ شاہ صاحب کو مناسب تھا۔ کہ اُس کو کھانے کے لئے اور اُس کو رات کو اپنے ہاں ٹھیرنے کے لئے کہتے۔ اور وہ شخص بھی یہی سمجھتا تھا۔ کہ میں اُن کے ہاں کھاؤنگا۔ اور اُنہیں کے ہاں رات کو رہونگا۔ شاہ صاحب کو یہ بھی خیال ہؤا۔ کہ اگر میں اس کو کھانا نہ کھلاؤں۔ اور رات کو رہنے کو نہ کہوں۔ تو اس کی نہایت دل شکنی ہوگی۔ مگر اُنہوں نے اُس کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ نہ اُس کو کھانا کھلایا۔ نہ رہنے کے لئے کہا۔ جب وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ تو شاہ صاحب نے لکھا ہے۔ کہ مجھ پر خدا تعالےٰ کی طرف سے خفگی ہوئی۔ اور کہا گیا۔ کہ یہ ایک نادانی کا کام تھا ✦

شاہ صاحب کو بلاشبہ اس بات کا رنج ہؤا ہوگا۔ کہ اُس کو کیوں نہیں کھانا کھلایا۔ اور کیوں نہیں رات کو رکھا۔ مگر اس رنج کو چونکہ وہ اہل اللہ تھے۔ خدا کے عتاب سے منسوب کیا۔ اگر کوئی دنیادار ہوتا۔ تو اُس کا کچھ بھی خیال نہ کرتا ✦

مثل اس کے ایک واقعہ ہم پر بھی گذرا ہے۔ بنارس میں ایک نہایت مقدس اور بزرگ شخص مجھ سے ملنے کو آئے۔ جب کہ میں انگلستان سے واپس آیا تھا۔ اور اُن بزرگ کا ارادہ تھا۔ کہ میرے ہاں رات کو رہیں۔ مگر کھانا دوسری جگہ کھائیں۔ مجھ کو یہ امر پسند نہ آیا۔ اور میں نے کہا کہ جہاں آپ کھانا کھائینگے۔ وہیں رات کو بھی رہیں۔ وہ بزرگ تھوڑی دیر مل کر چلے گئے اُن کے جانے کے بعد مجھ کو نہایت رنج و افسوس ہؤا۔ کہ میں نے یہ بات نہایت خلاف آدمیت اور خلاف مروت اور خلاف اخلاق کی۔ مگر چونکہ میں دنیادار تھا۔ اس لئے میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی۔ کہ خدا نے مجھ سے مواخذہ کیا ہے ✦

پس یہ عام واقعات ہیں۔ جو کم و بیش ہر ایک کو پیش آتے ہیں۔ اہل اللہ اُن کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور اہل دنیا اُن کو اتفاقی بات سمجھ کر ٹال دیتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے۔ ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

[1] دل میں آنے والی باتیں (احمد مجذومی)

اَلعَجَب ثُمَّ العَجَب

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تفہیمات الٰہیّہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "خدا نے معادن پر نظر رحمت ڈالی جو عناصر کے ٹکرانے اور ملنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اور اُن سے کہا کہ میں نے تجھ سے اپنا رب ہونا ظاہر کیا۔ تجھ کو میں نے اپنی خلق سے برگزیدہ کیا ہے۔ جو کچھ میں نے پیدا کیا ہے۔ تیرے لئے ہے اور آسمان اور زمین کو تیرا تابعدار بنایا ہے۔ اسی طرح خدا تعالےٰ معدنیات سے کہتا رہا۔ یہاں تک کہ پہلا دورہ ختم ہو گیا +

پھر معدنیات کی صورت خدا کے سامنے حاضر ہوئی۔ اور خدا کے سامنے عجز و نیاز کرنے لگی۔ تو خدا کی بارگاہ سے ایک فیض عجیب معدنیات کی صورت پر پڑا۔ کہ اُس میں تغذیہ کا اور نمو کا استعداد پیدا ہو گیا۔ اور نباتات پیدا ہو گئیں۔ اور معدنیات کی صورت پر غالب آئیں۔ اور معدنیات اُس میں چھپ گئیں اور خدا کی شان دوسری ہو گئی +

پھر خدا نے نباتات پر نظر رحمت ڈالی اور کہا۔ کہ جو کچھ میں نے پیدا کیا ہے۔ تیرے لئے ہے۔ میری خلقت میں سے تو ہی برگزیدہ ہے۔ اور تو ہی میرا مقصود ہے۔ اور تمام عالم تیری تابع ہیں۔ اسی طرح خدا تعالےٰ معدنیات سے کہتا رہا۔ یہاں تک کہ دورہ ختم ہو گیا۔ یعنی دوسرا دورہ +

پھر نباتات کی صورت خدا کے سامنے حاضر ہوئی اور عجز و نیاز کرنے لگی۔ تو خدا کی بارگاہ سے ایک فیض عجیب نباتات کی صورت پر پڑا۔ کہ اس میں ادراک اور حِس اور ارادہ کی قوت پیدا ہو گئی۔ اور اُس سے حیوان پیدا ہو گئے۔ اور معدنیات اور نباتات اُس میں چھپ گئیں۔ اب خدا نے حیوان پر نظر رحمت کی اور کہا۔ کہ جن کو میں نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے تو ہی میرا برگزیدہ اور تو ہی میرا محبوب ہے۔ اور تو ہی میرا مطلوب اور تو ہی عالم کے پیدا ہونے کا سبب ہے۔ اور تو ہی خلق کے پیدا ہونے کی علت فاعلی ہے۔ پھر اسی طرح خدا اس سے کہتا رہا۔ یہاں تک کہ دورہ ختم ہو گیا۔ یعنی تیسرا دورہ +

پھر حیوانات کی صورت خدا کے سامنے حاضر ہوئی۔ اور عجز و نیاز کرنے لگی۔ تو خدا کی طرف سے انسان کی صورت اُس پر فائض ہوئی۔ پھر اُس میں اُس سے افضل استعداد پیدا ہو گیا۔ جو اُن میں تھا۔ اور اصل صورت انسان کے دل اور عقل کے لطیفہ کا پورا ہونا ہے۔ پھر انسان کی نوع پیدا ہوئی۔ جن میں سب سے پہلے آدم علیہ السلام ہیں۔ اور خدا نے رحمت کی نظر سے اس کو دیکھا اور کہا۔ کہ تو عالم صغیر ہے خبر دینے والا عالم کبیر کا۔ تو ہی امانت کے لائق ہے۔ نہ آسمان اور زمینیں اور نہ پہاڑ۔ عالم کو تیرے لئے مسخّر کیا ہے۔ اور تیرے لئے مینہ برسایا ہے۔ اور نباتات اُگائے۔ اور تیرے لئے حیوانوں کو زمین میں پیدا

کیا۔ بیری خلقت میں تو ہی میرا محبوب ہے (انتہیٰ) گویا یہ چوتھا دورہ تھا +

شاید اسی مقام کے مناسب حافظ علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے۔ ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

قال اللّٰہ تعالیٰ۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا۔ وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۲۳ آیت ۷۲ سورۃ الاحزاب)

یعنی ہم نے پیش کیا امانت کو آسمانوں اور زمینوں کے اور پہاڑوں کے سامنے۔ پھر اُنہوں نے اُس کے برداشت کرنے سے انکار کیا۔ اور اُس سے ڈر گئے۔ اور اُس کو برداشت کیا انسان نے۔ بیشک وہ زیادتی کرنے والا اور ناوان تھا +

اس مقام پر ہم کو اس آیت کی نسبت بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ ہر کوئی جان سکتا ہے کہ جو چیز انسان میں حیوانوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ اُسی کی نسبت لفظ امانت کا کہا گیا ہے۔ مگر جو کچھ کہ تعجب ہم کو ہے۔ وہ اس بات سے ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ان چاروں دوروں کا ہونا اور خصوصاً اس طرح پر جس طرح پر کہ انہوں نے بیان کیا ہے۔ کہاں سے اخذ کیا ہے۔ جو لوگ کہ ڈارون کی تھیوری کے قائل ہیں۔ وہ تو شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان سے انقلاب کی تھیوری پر استدلال کرتے ہیں۔ اور جو لوگ انقلاب کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ مماثلت کے قائل ہیں۔ جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ وہ اُن کے بیان سے مماثلت کی تھیوری پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر جب تک یہ معلوم نہ ہو۔ کہ کہاں سے ان دوروں کا شاہ ولی اللہ صاحب نے استنباط کیا ہے۔ اُس وقت تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا ہے +

البتہ توریت میں ہے۔ کہ زمین نے سبزہ زار اور درختانِ میوہ دار کو اُگایا۔ اور خدا نے اُن کو دیکھ کر کہا۔ کہ بہت اچھا ہے۔ پھر خدا نے پانیوں کو کہا۔ کہ پانی کے جانور اور اُڑنے والے جانور پیدا کریں۔ اور خدا نے اُن کو دیکھ کر کہا۔ کہ بہت اچھا ہے +

پھر خدا نے زمین کو کہا۔ کہ زمین پر چلنے والے جانور پیدا کرے۔ اُس نے پیدا کئے۔ اور خدا نے اُن کو دیکھ کر کہا۔ کہ بہت اچھا ہے +

پھر خدا نے اپنے مشابہ انسان کو پیدا کیا۔ مگر جو طرز بیان کہ شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے۔ اور جو طرز بیان کہ توریت میں ہے۔ وہ یکساں نہیں ہے۔ مگر ہم کو پتہ نہیں لگتا۔ کہ شاہ صاحب نے وہ بیان کہاں سے اخذ کیا ہے۔ اگر انہوں نے بذریعہ اپنے مکاشفہ کے بیان کیا ہے۔ تو اس میں کچھ کلام نہیں۔ اور اگر انہوں نے کتاب اور سنت سے اخذ کیا ہے۔ تو ہم کو امید ہے۔ کہ کوئی دوست ہم کو اُس کے ماخذ سے مطلع فرماویگا +

صبأنا صبأنا[51]

یہ کس نے کہا؟ بنی خزیمہ[52] نے۔ مگر افسوس ہے کہ حضرت خالد ابن ولید اس کا مطلب نہیں سمجھے اور اُن کو قتل کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے خالد ابن ولید کو بنی خزیمہ کے پاس بھیجا۔ کہ اُن کو اسلام کی طرف دعوت کریں۔ بنی خزیمہ نے بجائے اس کے کہ۔ 'اسلمنا' کہیں 'صبأنا صبأنا' کہا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنے مذہب سے پھر گئے۔ یعنی مسلمان ہو گئے۔ حضرت خالد اس مطلب کو نہیں سمجھے۔ اور اُن کو قتل کر دیا۔ جب رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ اے خدا میں بری ہوں اُس کام سے جس کو خالد نے کیا۔

غور طلب یہ بات ہے کہ جو لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب میں آتے ہیں۔ اُن کے دل میں کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ جس کے سبب سے وہ دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں۔

جو لوگ کسی خوف سے یا کسی لالچ سے اپنا پہلا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں۔ وہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔ ہم اس بات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ کہ دوسرے مذہب کی کیا خوبی نہایت سچائی سے اُن کے دل میں بیٹھتی ہے۔ جس سے وہ پہلا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص نے اپنے مذہب میں جس میں کہ وہ ہے سخت پابندیاں اور سخت احکام دیکھے۔ جس سے اُس کو اپنی زندگی تلخ معلوم ہوئی۔ اور دوسرے مذہب میں اُس نے آسانی اور اُن سخت پابندیوں سے نجات دیکھی۔ اور اس لئے اُس مذہب کو اختیار کر لیا۔ تو اُس کو بھی ہم انہیں شخصوں میں شمار کرینگے۔ جنہوں نے کسی لالچ سے دوسرا مذہب اختیار کیا ہے۔ حالانکہ ہم اُس سچائی کی تلاش کے درپے ہیں جو دوسرے مذہب کی اُس کے دل میں بیٹھی اور اُس کے سبب سے اُس نے دوسرا مذہب اختیار کیا۔

---

[51] یہ صیغہ واحد متکلم ہے۔ از مصدر صبأ و صبوءٌ۔ از باب فتح یفتح۔ ایک دین سے دوسرے دین میں چلنا اسی سے ہے صابی۔ جس کی جمع صابئون ہے۔ (احمد مخدومی)

[52] ایک قبیلہ ہے قریش سے۔ منہ

اس بات کا ہم کو یقین نہیں ہوتا۔ کہ جو دوسرا مذہب اُس نے اختیار کیا ہے اُس کے تمام مسائل اور عقائد پر اس نے بخوبی غور کر کے اور ہر ایک مسئلہ اور عقیدہ کو دوسرے مذہب کے عقائد اور مسائل پر ترجیح دے کر دوسرا مذہب اختیار کیا ہو۔ کیونکہ یہ امر تو نہایت مشکل کام ہے۔ ایک بہت بڑا عالم بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ پس کیا چیز ہے جو مذہب کو بدلوا دیتی ہے +

صحبت بھی دوسرے مذہب کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ مگر ہم اس کو بھی اُس میں شمار نہیں کرتے۔ جس میں کسی شخص نے نہایت سچائی اور ایمانداری سے دوسرے مذہب کو سچ اور برحق سمجھ کر اختیار کیا ہو۔ اور اپنا مذہب چھوڑ دیا ہو +

لوگ کہتے ہیں۔ کہ سیدھی راہ اختیار کرنی خدا کی ہدایت پر موقوف ہے۔ ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ سیدھی راہ یعنی مذہب حق اختیار کرنا بلاشبہ خدا کی ہدایت پر موقوف ہے۔ مگر اُن کی نسبت ہم کیا کہیں کہ جو مذہب حق کو چھوڑ کر دوسرا مذہب جو گمراہی ہے اختیار کرتے ہیں۔ ہدایت اور گمراہی دونو خدا کے اختیار میں ہیں۔ مگر ہم اس بات کی تلاش میں ہیں۔ کہ کیا چیز انسان کے دل میں آجاتی ہے جس کے سبب وہ مذہب تبدیل کر ڈالتا ہے خواہ وہ مذہب جو اُس نے پہلا مذہب تبدیل کر کے اختیار کیا ہے حق ہو یا باطل ہو +

موجودہ اور گذشتہ زمانہ کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ اُن اسباب کے جو ہم نے اوپر بیان کئے یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کے دل کو کسی مذہب کی کچھ باتیں کسی دلیل سے یا بغیر کسی دلیل کے سچ اور صحیح معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور وہ اُن کو نہایت نیک نیتی سے اور سچے دل سے سچا اور برحق سمجھتا ہے۔ اور اس لئے اُس مذہب کو اختیار کر لیتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اُس مذہب کی تمام باتیں اُس کو سچی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور وہ اُس مذہب کو پورا پورا اختیار کر لیتا ہے +

اس بات کا سبب کہ اُس شخص کو کسی مذہب کی کچھ باتیں کیوں سچ معلوم ہونے لگتی ہیں زیادہ تر اُن لوگوں کی بزرگی اور تقدس اور اخلاق کی خوبی۔ نیکی اور نیک خصلت پر منحصر ہوتا ہے۔ جو اُس مذہب کا وعظ کرتے ہیں یا اُس مذہب کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ خود بھی وہی کرتے ہیں۔ جو کہتے ہیں۔ اُن کا قول اور فعل۔ ظاہر و باطن سب

یکساں ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام اُن صفات کے جامع ہوتے ہیں۔ جو انسان میں حسب فطرت انسانی جمع ہوسکتی ہیں۔ اُن کا وظیفہ شبانہ روزی انسان کو خدائے واحد کی پرستش اور نیکی اور نیک دلی کی ہدایت کرنا ہوتا ہے۔ اور جو کہ اُن کا طریقہ عمل بالکل اُس کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کی وہ لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں۔ اور وہی خود بھی کرتے ہیں۔ جو لوگوں سے کرنے کو کہتے ہیں۔ اس لئے درحقیقت وہ معصوم ہوتے ہیں۔ یعنی بُری باتوں سے محفوظ اور اچھی باتوں میں مشغول رہتے ہیں۔ پس ہمارے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا ضرور ہے۔ اور اگر معصوم نہ ہوں تو اُن سے پوری پوری امت کی ہدایت غیر ممکن ہے۔

یہی طریقہ اب تک چلا آتا ہے علماء کو جنہوں نے اپنی تمام زندگی علوم کے حاصل کرنے میں صرف کردی ہے اُن کو تو علیحدہ رکھو۔ مگر جن لوگوں نے روحانی نیکی حاصل کرنے پر توجہ کی ہے خواہ وہ عالم ہوں یا جاہل۔ ہاں اگر عالم بھی ہوں تو نورٌ علیٰ نور ہیں۔ اُن کے اخلاق اور اوصاف انبیاء علیہم السلام کے اخلاق اور اوصاف کے زیادہ مشابہ ہو جاتے ہیں۔ اور اُنھی سے صراط مستقیم یعنی مذہب اسلام کی اشاعت ہوتی ہے۔ یہی حال ہندوستان میں ہوا ہے۔ علماء کے ذریعہ سے تو شاید دو چار دس پانچ آدمی مسلمان ہوئے ہوں۔ مگر فقراء اور اولیاء اللہ کی بدولت ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمان ہوئے ہیں۔ پس مذہب کی خوبی اُنہیں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے جو نیکی کا پُتلا ہو جاویں۔ ورنہ ایسے لوگ تو بہت مارے مارے پھرتے ہیں جن کی نسبت حافظ نے کہا ہے کہ ؎

واعظاں کیں جلوہ در محراب و منبر مے کنند
چوں بخلوت مے روند آں کار دیگر مے کنند

اللھم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ آمین

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کا مذہب حنیف

مامون رشید کے زمانہ میں عبدالمسیح ابن اسحٰق کندی جس کا عیسائی مذہب تھا۔ اور بہت بڑا عالم تھا۔ مامون رشید کے دربار میں ایک بہت معزز عہدہ پر ملازم تھا۔ مامون رشید کے ایک قریبی رشتہ دار نے جس نے اپنا لقب الہاشمی قرار دیا ہے ایک خط عبدالمسیح کے نام دعوت اسلام کا بھیجا اور یہ خواہش کی کہ وہ بھی مسلمان ہو جائے۔ عبدالمسیح نے نہایت سختی سے اُس خط کا جواب لکھا ہے اور اسلام قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ اُس جواب میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس زمانہ تک جب کہ وہ پیغمبر ہوئے یعنی پچھتر برس کی عمر تک بت پرستی کیا کرتے تھے۔ اور وہی بت پرستی کا مذہب مذہب حنیف کہلاتا تھا۔ مگر یہ دونوں باتیں محض غلط ہیں۔ توریت مقدس سے یا اور کسی کتاب سے ثابت نہیں ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے کسی وقت اور کسی زمانہ میں بت پرستی کی ہو۔ بلکہ برخلاف اس کے قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی بت پرستی یعنی شرک نہیں کیا۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کی نسبت متعدد جگہ آیا ہے۔ کہ "ما کان من المشرکین" یعنی ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اور خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں مذکور ہے۔ کہ حضرت ابراہیم نے کہا "ما انا من المشرکین" یعنی میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ پس بلا سند اور بلا دلیل یہ کہنا۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پچھتر برس کی عمر تک بت پرستی کرتے تھے محض بے اصل اور صرف اتہام ہے۔ پچھتر برس کی عمر ہم نے توریت کے حساب سے لکھی ہے۔ مگر جو عمریں توریت میں لکھی ہوئی ہیں۔ اُن کی صحت نہایت مشتبہ اور بحث طلب ہے۔

تمام انبیاء اُسی قوم میں سے پیدا ہوتے ہیں اور اُسی قوم میں پلتے اور بڑھتے ہیں جس کی بُری باتوں کی اصلاح کے لئے وہ مبعوث ہوتے ہیں لیکن اُن کا یہ امر طبعی ہوتا ہے کہ جن بُری باتوں کی اصلاح وہ اپنے زمانہ رشد میں کرتے ہیں۔ ابتدا ہی سے اُن کو اُن سے نفرت ہوتی ہے۔ اور اس لئے کبھی وہ اُن امور میں ملوث نہیں ہوتے۔ اگر وہ ان میں ملوث ہوں تو زمانہ رشد میں اُن امور کی اصلاح ان سے ہونی نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ جو مقتضائے طبیعت ہوتا ہے۔ وہی زمانۂ رشد میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس گو حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جو بت پرستی میں ملوث تھا۔ مگر صرف ایسے خاندان میں پیدا ہونے سے یہ خیال نہیں ہو سکتا۔ کہ انہوں نے بھی بت پرستی کی ہو۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت بت پرستی کا خیال سراسر غلط اور محض بیہودہ ہے۔

اور یہ بات بھی کہ وہی بت پرستی کا مذہب مذہب حنیف کہلاتا تھا۔ محض غلط ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مذہب توحید ذات باری کا تھا۔ اور اُن کے مراسم مذہبی جیسے کہ حج خانہ کعبہ کا ہے تمام ملک عرب میں پھیل گئے تھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مذہب توحید مذہب حنیف کہلاتا تھا۔ اُس کے بعد لوگوں نے بت پرستی کو اس مذہب میں ملا دیا تھا۔ مگر وہ ابراہیمی مذہب کے مراسم بھی مثل حج کعبہ وغیرہ ادا کرتے تھے۔ اور اس لئے اپنے مذہب کا وہی پرانا نام لیتے تھے اور مذہب حنیف کہتے تھے۔ مگر بُت پرستی مذہب حنیف ابراہیمی میں نہ تھی۔ چنانچہ تاج العروس شرح قاموس میں لکھا ہے +

وکان عبدۃُ الاوثانِ فی الجاھلیّۃِ یقولُون نحنُ حُنفاءُ علیٰ دینِ ابراھیم۔ فلمّا جاء الاسلامُ سمّوا المسلمَ حنیفاً۔ وقال الاخفش وکان فی الجاھلیّۃِ۔ یقال من اختتن وحجّ البیت۔ قیل لہ حنیفٌ۔ لانّ العرب لم تتمسّک فی الجاھلیّۃِ بشیٍٔ من دین ابراھیم غیر الختان وحج البیت وقال الزجاجیُّ الحنیفُ فی الجاھلیّۃ من کان یحجّ البیت۔ ویغتسل من الجنابۃ۔ ویختتن۔ فلمّا جاء الاسلام کان الحنیف المسلم لعُدولہ عن الشّرک +

"یعنی بت پرست لوگ ایام جاہلیّت میں دعویٰ کرتے تھے کہ ہم حنیف ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السّلام کے مذہب پر ہیں۔ جب مذہب اسلام کا ظہور ہوًا۔ تو مسلمانوں کو بھی حنیف کہنے لگے۔ اخفش نے کہا ہے کہ زمانۂ جاہلیّت میں جو لوگ ختنہ کرتے تھے اور کعبہ کا حج کرتے تھے۔ اُن کو حنیف کہتے تھے۔ کیونکہ اُس زمانہ میں عرب کے لوگوں نے سوائے ختنہ اور حج کعبہ کے ابراہیمی مذہب میں سے کوئی چیز اختیار نہیں کی تھی۔ زجاجی کہتا ہے کہ عرب جاہلیّت اُن لوگوں کو جو کعبہ کا حج کرتے تھے۔ اور جنابت کے بعد غسل کرتے تھے۔ اور اُن میں ختنہ کی رسم بھی جاری تھی حنیف کہتے تھے۔ جب اسلام شروع ہوًا تو مسلمانوں کو بھی حنیف اس لئے کہنے لگے۔ کہ وہ شرک سے باز رہے تھے" +

پس یہ کہنا کہ جو مذہب بُت پرستی کا تھا وہی مذہب حنیف کہلاتا تھا۔ صریح غلطی ہے۔ خدا نے اس التباس کو جابجا قرآن مجید میں رفع کیا ہے۔ کیونکہ جہاں قرآن مجید میں مذہب حنیف کا ذکر آیا ہے۔ اُسی کے ساتھ اُس مذہب کے شرک

سے بری ہونے کا بھی ذکر آیا ہے جس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حنیف سے وہ مذہب مراد نہیں ہے جس میں شرک اور بُت پرستی داخل ہوگئی تھی۔ اور جس کو مشرکان زمانۂ جاہلیت مذہب حنیف کہتے تھے۔ بلکہ خاص مذہب توحید ذات باری جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مذہب تھا۔ لفظ حنیف سے وہی مذہب مراد ہے نہ وہ مذہب جس کو مشرکین عرب مذہب حنیف کہتے تھے۔

سورہ بقر میں خدا نے فرمایا ہے "وقالوا کونوا ھودا او نصاری تھتدوا۔ قل بل ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین" (آیت ۱۲۹) یعنی اور کہتے ہیں کہ ہوجاؤ یہود یا نصاریٰ تو راہ پر آؤ گے۔ اے پیغمبر کہدے کہ نہیں ہم نے ابراہیم کا مذہب اختیار کیا ہے جو ایک خدا کا ہو رہا تھا۔ اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورۂ آل عمران میں خدا نے فرمایا ہے "ماکان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما وما کان من المشرکین" (آیت ۷۰) یعنی ابراہیم یہودی تھا نہ نصرانی بلکہ ایک خدا کا ماننے والا مسلمان تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورہ آل عمران میں دوسری جگہ خدا نے فرمایا ہے "قل صدق اللّٰہ فاتبعوا ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین" (آیت ۸۹) یعنی اے پیغمبر کہدے خدا نے سچ فرمایا ہے کہ تم ابراہیم کے مذہب کی پیروی کرو۔ جو ایک خدا کا ماننے والا تھا۔ اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورۂ انعام میں خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول فرمایا ہے "انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین" (آیت ۷۶) یعنی میں نے اپنا منہ اُس کی طرف پھیرا ہے۔ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اُسی کا ماننے والا ہو کر اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اور سورہ انعام میں دوسری جگہ خدا نے فرمایا ہے "قل اننی ھدانی ربی الی صراط مستقیم دینا قیما ملۃ ابراھیم وما کان من المشرکین" (آیت ۱۶۲) یعنی اے پیغمبر کہدے کہ مجھ کو میرے پروردگار نے سیدھے رستہ کی ہدایت کی ہے۔ یعنی صحیح مذہب کی جو ابراہیم کا مذہب تھا۔ اور جو ایک خدا کا ماننے والا تھا۔ اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

سورۂ یونس میں خدا نے فرمایا ہے۔ "وان اقم وجھک للدین حنیفا ولا تکونن من المشرکین" (آیت ۱۰۵) یعنی مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنا منہ مذہب کی طرف سیدھا رکھ ایک خدا کا ماننے والا ہو کر اور شرک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

سورۂ نحل میں خدا نے فرمایا ہے "ان ابراھیم کان امۃ قانتا للہ حنیفا ولم یک من المشرکین (آیت ۱۲۱) یعنی ابراہیم ایک بزرگ تھا۔ خدا کی عبادت کرنے والا اور ایک خدا کے ماننے والا اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا +

سورۂ نحل میں دوسری جگہ خدا نے فرمایا ہے " ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین " (آیت ۱۲۴) یعنی پھر ہم نے تیرے پاس وحی بھیجی کہ مذہب ابراہیم کی پیروی کر جو ایک خدا کا ماننے والا تھا۔ اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا +

سورۂ حج میں خدا نے فرمایا ہے " فاجتنبوا الرجس من الاوثان و اجتنبوا قول الزور حنفاء للہ غیر مشرکین " (آیت ۳۱ و ۳۲) یعنی تم بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو ایک خدا کے ماننے والے اور اس کے ساتھ شرک نہ کرنے والے ہو کر +

سو بنیہ میں خدا نے فرمایا ہے " وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ وذلک دین القیمہ " (آیت ۴) یعنی اُن کو یہی حکم ہوا تھا ۔ کہ خدا کی عبادت کریں خالص اس کے لئے اور بندگی کریں اُس کی مخلص ہو کر۔ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں - اور یہی مذہب ٹھیک ہے +

پس بت پرستی کے مذہب کو مذہب حنیف قرار دینا نہایت بڑی غلطی ہے"



سرسید کا خط آیت

اِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ

کی تفسیر میں

تفسیر القرآن سید احمد خاں کے قدردان رجو اُن کے استدلالات کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں) اس کو پڑھ کر لذت روحانی پائیں۔ اور فائدہ اٹھائیں۔ کہ یہ تحریر تفسیر کے ایک مقام کی تشریح ہے۔ میں اس کے تلف ہو جانے سے ڈرا۔ اور چاہا کہ آیندہ نسلوں کے لئے اسے مضبوط و محفوظ کر دوں اس لئے حضرت مولوی حالی کو لکھا:۔

بخدمت عالی جناب حالی اللہ الوالی مخدوم و مطاع من

سرسید احمد خاں (ہائے سرسید!) علیہ الرحمۃ والغفران کے ایک خط کی نقل خدمت شریف میں روانہ کرتا ہوں۔ حیات جاوید میں میرے ولادت مسیح والے خط کے ساتھ درج ہونے کے قابل ہے۔

خط نقل کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ظاہر کر دوں کہ یہ گرامی نامہ رجو درحقیقت تفسیر القرآن کا ایک جزو ہے) مجھ تک کیونکر پہنچا۔

تفسیر القرآن میں آیت۔ وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ و یوم القیٰمۃ یکون علیھم شھیدا کا ترجمہ کیا ہے۔ اور نہیں کوئی اہل کتاب میں سے۔ مگر کہ یقین کرے ساتھ اس کے (یعنی حضرت عیسےٰ کے صلیب پر مارے جانے کے) قبل اپنے مرنے کے (یعنی بعد مرنے کے وہ جان لیگا کہ صلیب پر حضرت عیسےٰ کا مرنا غلط تھا) اور قیامت کے دن حضرت عیسےٰ اُن پر گواہ ہونگے (یعنی اہل کتاب کو اپنی زندگی میں جو عقیدہ تھا۔ اُس کے برخلاف گواہی دینگے) سورہ نسا آیت ۱۵۷۔

اس ترجمے سے میرے دل میں کئی شکوک پیدا ہوتے تھے۔ خاص کر یہ کہ اس آیت سے پایا جاتا ہے۔ کہ سب اہل کتاب اپنے مرنے سے پہلے جناب عیسےٰ مسیح پر ایمان لائینگے۔ جو بظاہر معلوم نہیں ہوتا۔

سید میر حسن صاحب سیالکوٹ کے رہنے والے ایک واجب التعظیم بزرگ

اور میرے بڑے مہربان ہیں۔ وہ جب کبھی (سنہ ۱۸۹۸ء سے جو سال رحلت سرسید ہے اور میرے لئے عام الحزن۔ مولوی امام الدین گجراتی۔ اور میر صاحب موصوف سے بسبب اتحاد خیالات مذہبی۔ تعارف اور تعارف سے الفت اور محبت پیدا ہوگئی) لاہور تشریف لاتے ہیں۔ تو اپنے قدوم میمنت لزوم سے میرے کلبۂ احزان کو رشک گلستاں بناتے ہیں۔ اُن سے میں نے اس ترجمے کی تشریح کی استدعا کی۔ میر صاحب نے فرمایا کہ سیالکوٹ جا کر سرسید کا خط جو میرے ایسے ہی شبہات کے جواب میں آیا تھا۔ نقل کر کے بھیجدونگا۔ میں نے یاددہانی کے ذریعہ سے نقل خط اُن سے منگوائی۔ میر صاحب کے خط کی نقل کی بھی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ سرسید کے جواب نے اُس سے مستغنی کر دیا ہے۔ اس خط کو پڑھ کر میری عجیب کیفیت تھی۔ میں نے میر صاحب کو لکھا۔ کہ میرے تمام تر شبہات دلی کے جوابات خدا نے بطور الہام سرسید کے قلم سے لکھوا کر میری خاطر آپ کے پاس بطور ودیعت رکھوا دیئے تھے۔ پس اب وہ امانت حق دار کو ملگئی۔ واللہ ذوالفضل العظیم یھدی من یشاءُ الی صراط المستقیم +

جواب

جناب مولوی احمد بابا مخدومی دام مجدہم!

عنایت نامہ پہنچا۔ اس خاص عنایت کا شکریہ قبول ہو۔ بلاشبہ سرسید علیہ الرحمۃ کی یہ تحریر اس قابل ہے کہ حیات جاوید میں آپ کے خط کے ساتھ اُس کو درج کیا جائے +

لیکن چونکہ اب امید نہیں ہے کہ حیات جاوید کو میں تیسری بار چھپوا سکوں۔ اس لئے سردست اُس کا کتاب میں درج ہونا غیر ممکن ہے۔ پہلے دونو اڈیشن اب تک ڈپوٹی شاپ میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر کس امید پر تیسرے ایڈیشن کے چھاپنے کی کوئی جرأت کر سکتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ کہ آپ اپنی کتاب میں اور میں اپنے نسخے میں حاشیہ پر اس عبارت کو درج کر لوں۔ اس کے سوا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا۔ زیادہ نیاز۔ خاکسار الطاف حسین حالی۔ از پانی پت +

اب اس خط کو یہاں درج کرتا ہوں۔

خط متضمن شرح تفسیر آیہ اِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ ممنون کیا۔ میں کسی قدر بیمار ہوگیا تھا۔ اب خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ جو ترجمہ آیت کا آپ نے بطور مثبت بحذف دونو نفیوں کے کیا ہے۔ اور جو ترجمہ میں نے کیا ہے۔ دونو نفیوں کو قائم رکھ کر۔ دونو ترجموں کا مطلب واحد ہے۔ مگر آپ کے ترجمے میں کسی قدر نقصان ہے +

آپ کا ترجمہ یہ ہے "سب کے سب اہل کتاب اُس پر ایمان لاوینگے پیشتر اپنے مرنے کے" شبہ جو آپ کو واقع ہوا ہے۔ بہٖ کی ضمیر راجع کرنے میں ہوا ہے۔ اس آیت سے پہلی آیت میں۔ وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ ہے +

بہٖ کی ضمیر راجع ہے قَوْلِهِمْ کی طرف مع ان کے مقولے کے۔ نہ حضرت مسیح کی طرف۔ اب معنی یہ ہوئے کہ سب کے سب اہل کتاب حضرت مسیح کے قتل پر یقین کرینگے پیشتر اپنے مرنے کے۔ اس کے آگے ہے۔ ویوم القیمۃ یکون (عیسٰے) علیهم شهیداً +

علٰے کا لفظ واسطے حرج یا نقصان یا خلاف کے آتا ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ قیامت کے دن حضرت عیسٰے برخلاف اُن کے یقین کے شاہد ہونگے۔ نون ثقیلہ مع لام تاکید اُس فعل کے وقوع کو زمانۂ مستقبل میں لازمی و ضروری کر دیتا ہے۔ مگر زمانۂ موجود میں بھی اس فعل کے وقوع کی نفی اس کو لازم نہیں "فلاں شخص اس بات کو ہرگز نہیں مانیگا" اس جملے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اب مانتا ہے۔ آیندہ نہیں مانیگا "وہ کہیگا کہ حضرت مسیح کو مار ڈالا ہے" اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اب نہیں کہتا +

ایسے مواقع پر مضارع کے صیغے فائدہ استمرار کا دیتے ہیں۔ یعنی کہے جاویگا۔ کبھی اُس کو مانیگا نہیں۔ اردو ترجمے میں جو کسی فعل کو مستقبل بنایا جاتا ہے۔ اور گا اُس سے شامل کیا جاتا ہے۔ تو کوئی لفظ دو نون کو ملانے کے لئے بڑھایا جاتا ہے۔ جیسا آپ نے "ایمان لاوینگے" میں "لاوین" کا لفظ داخل کیا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ لانے کا لفظ اُردو زبان میں ظاہر کرتا ہے۔ کہ پہلے وہ شے نہ تھی۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ سے اُس شے کا موجود نہ ہونا ظاہر نہیں۔ ایمان کے لفظ سے معنی خاص سمجھنا ہی غلط ہے۔ خصوصاً جب کہ بہٖ کی ضمیر قولهم کی طرف ہے۔ نہ حضرت مسیح کی طرف +

یومنون کا ترجمہ یقین کریں۔ قرآن مجید کے سیاق کے میری دانست میں نہایت مناسب ہے۔ معلوم نہیں کہ لفظ کرے کو آپ نے کیا سمجھا ہے؟ وہ تو معنی استقبال کے دیتا ہے۔ اور استمرار کا اشارہ بتاتا ہے۔ جو خاص سیاق آیت کا ہے +

"یہ" کا استعمال اردو زبان کے محاورے میں فائدہ تاکید کا بھی دیتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال کس کس طرح پر ہوتا ہے۔ لکھنا طویل بات ہے۔ مگر ترجمے میں لفظ (یہ کہ) وہی فائدہ دیتا ہے۔ جو لام تاکید و نون ثقیلہ نے دیا ہے +

مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہود اپنی بات پر تمام عمر یقین کرینگے کہ اُنہوں نے عیسٰے کو مار ڈالا +

والسلام (خاکسار سید احمد۔ علی گڈھ۔ ۱۲۔ جنوری ۱۸۹۶ء)[۵]

[۵] میں نے یہ خط علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے پرچہ بابت ۹ مارچ ۱۹۱۰ء میں چھپوا دیا تھا۔ (مخدومی)

احادیث

جناب عالی!

ایک مدت دراز سے مذہب علماء و عام اسلامیان کا اقوال امام ابوحنیفہؒ۔ مالکؒ وشافعیؒ و احمد رحمہم اللہ تعالےٰ پر چلا آتا تھا۔ اور اہل علم اپنے اپنے ائمہ کی تائید کرتے۔ اور عمل قرآن و حدیث جو اصلی اسلام ہے مفقود تھا۔ چونکہ ہر کام وقت پر موقوف ہوتا ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ دہلوی نے تابمقدور بیخ کنی شرک و بدعت میں کوشش کر کے جو تمام ہندوستان و پنجاب میں جا بجا پھیلا ہوا تھا۔ عمل قرآن و حدیث جاری کر دیا۔ اور جناب کو بھی بذریعہ اسی خاندان عالی کے یہ سعادت نصیب ہوئی۔ اور بعد میں عین مصیبت کے وقت جو امداد اہل حدیث کو جناب نے دی سو وہ میرے نزدیک جناب کی نجات کے واسطے کافی ہوگی۔ مگر ایک بات تعجب اور حیرانی کی جو میرے دماغ کو چکر میں رکھتی ہے یہ ہے کہ جو آرٹیکل زبان درفشان سے تہذیب الاخلاق میں مشتہر ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے برخلاف حدیث کے ہوتے ہیں۔ جن سے پرلے درجہ کی بے اعتباری حدیث کی پائی جاتی ہے۔ اور اکثر معتقدین جناب کے تاثیر مضامین حضور والا سے بروقت پیش کرنے حدیث کسی اہل علم کے اس قسم کی تحقیر و تخفیف و انکار کرتے ہیں۔ کہ گویا اُن کے نزدیک ایک پوچ بات بیان کی گئی ہے۔ جب کسی انگریز مؤرخ کا تذکرہ تعریف بیان ہو۔ تو بڑے ادب اور توجہ سے سنا جاتا ہے اور بعد میں اُس کی تعریف بھی ہوتی ہے۔ اب میں جناب کی خدمت میں بڑے ادب سے عرض کرتا ہوں۔ کہ پیغمبر علیہ السلام کا یہی ادب ہے۔ اور اس خیال سے سعادت اتباع سنن جو باعث تقرب الی اللہ ہے ہو سکتا ہے۔ اور عبادت مسنونہ کی ترک یا تخفیف کسی سلف یا خلف کا مذہب ہے؟ بلکہ اکابران اسلام۔ حسبنا کتاب اللہ و کتاب الرسول پر گئے ہیں۔ اور ہم کو تو آپ بھی اُن میں سے نظر آتے ہیں۔ مگر با ایں ہمہ بڑے بھاری رکن اسلام کو آپ اُکھاڑنا چاہتے ہیں۔ کیا اس عمر میں یادگار آپ کی اچھی ہے کہ آپ ذرا توجہ سے غور فرماویں۔ کہ فقہ تو بوجہ اقوال علماء کے رخصت ہوگئی۔ اور حدیث یوں بذریعہ حضور لُٹی گئی۔ اب جزئیات اور مجمل کی بابت عبادات و اخلاق میں کیونکر عملدرآمد ہوگا۔ اور تخفیف کلام نبوی کی جواب دہی کس کے ذمہ ہوگی؟ اور بڑے بڑے

محدثین نے کیوں خدمت تالیف حدیث کا عمل لغو کیا۔ اگر کوئی بات میری جہالت سے گستاخی کی نکل گئی ہو۔ تو معاف فرما کر جواب سے سرفراز فرماویں +

راقم بندہ میراں بخش از گجرات ۔ ۷۔ اگست ۱۸۹۷ء

جواب

مخدومی مکرمی شیخ میراں بخش صاحب!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۷۔ اگست ۱۸۹۷ء پہنچا۔ آپ کی عنایت اور مہربانی کا ممنون ہُوا۔ آپ نے جو شبہ ارقام فرمایا ہے وہ بلاشبہ ہر ایک مسلمان کے دل میں گذرتا ہوگا۔ اور میں خوش ہوں کہ آپ کے دل میں بھی یہ شبہ گذرا۔ مگر ایک مسلمان دل سے یقین رکھتا ہے کہ اُس کو خدا اور رسول کی اطاعت فرض ہے۔ اور ہر ایک شخص سمجھتا ہے کہ خدا کی اطاعت تعمیل احکام قرآن مجید ہیں۔ اور رسول کی اطاعت اس کے اقوال اور افعال کی پیروی ہے۔ جو حدیثوں میں پائی جاتی ہیں منحصر ہے۔ قرآن مجید کو باللفظ خدا کا کلام ہونے اور واجب التعمیل ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ پس قرآن مجید تو موجب مذہب مسلمانوں کے ایک امر مسلم ہے جس میں کچھ کلام نہیں ہوسکتا۔ باقی رہی حدیث۔ اس بات میں تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ کہ احادیث قریباً کل کے بالمعنی روایت ہوئی ہیں نہ باللفظ یعنی ان کے الفاظ بعینہٖ وہ نہیں جو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ بلکہ جو کچھ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو۔ اُس مضمون کو راویوں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ پس احادیث میں دو امر کی تنقیح لازم آتی ہے۔ اول یہ کہ جو کچھ حدیث میں بیان ہوا ہے وہ درحقیقت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ دوم یہ کہ جو کہ الفاظ ان حدیثوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ وہ اسی مضمون اور مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ جو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا +

تیسری ایک اور بات بھی ہے کہ جو قصص اور حکایات یہودیوں اور عیسائیوں یا اوروں کے مشہور تھے۔ اور اُن کو راویوں نے خواہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے یا اور کسی سے سُنا اور یہ سمجھ کر کہ یہ اصلی فرمودہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے یا نہیں۔ غرض کہ احادیث خواہ بخاری کی ہوں خواہ مسلم کی قرآن مجید کے برابر نہیں ہیں۔ اور اُن سے بجز ظن کے کوئی امر یقینی پیدا نہیں ہوتا۔ پس ہر ایک مسلمان کا کام ہے۔ کہ جہاں تک اس سے ہو سکے احادیث

کی سعی اور کوشش کریں۔ محدثین کے حالات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے حدیث کے جمع کرنے میں بے انتہا کوشش کی ہے۔ خداوند اُن کو جزائے خیر دے۔ مگر سب کا دار و مدار یہاں تک کہ بخاری اور مسلم کا بھی۔ راویوں کے معتمد اور غیر معتمد سمجھنے پر رہا ہے جس راوی کو انہوں نے معتبر سمجھا۔ اُس کی حدیث کو معتبر جانا۔ اور جس راوی کو نامعتبر سمجھا اس کی حدیث کو معتبر نہ جانا۔ مگر یہ بات غور کرنے کی ہے۔ کہ صحیح بخاری ہو یا مُوطّا امام مالک کی۔ اُن میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم تک تین تین۔ چار۔ چار راوی ہیں۔ اور حضرت امام مالکؒ نے یا محمد اسماعیل بخاری نے اس راوی کے سوا جس نے وہ حدیث نقل کی۔ اوپر کے راویوں کو نہیں دیکھا تھا۔ پس اس بات پر یقین کرنا کہ تمام راوی معتمد تھے۔ اور نیز انہوں نے اس مضمون کے بیان کرنے میں کچھ غلطی نہیں کی نہایت مشکل ہے۔ علاوہ اس کے اسمار رجال کی جو کتابیں ہیں وہ اور مشکلات پیدا کر دیتی ہیں یعنی ایک کتاب میں ایک راوی کو معتبر لکھا ہے اور دوسری کتاب میں اُسی راوی کو نامعتبر۔ پس ہم کو اس بات کے کہدینے سے کہ راوی اس کے معتبر ہیں کوئی طمانیت اور یقین نہیں ہو سکتا۔ حدیثوں کے جانچنے اور صحیح قرار دینے کے لئے ظاہرا یہی طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ جو اگلے محدثین نے اختیار کئے ہیں۔ مگر ایک اور طریقہ بھی ان سب سے اسلم ہے۔ جس کا نام درایت ہے۔ یعنی نفس حدیث پر غور کرنی اور سمجھنا کہ وہ شان نبوت کے مناسب ہے اور فی نفسہ صحیح بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ جامعین حدیث نے راویوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے پر زیادہ تر خیال کیا ہے۔ اور درایت پر بہت کم خیال کیا ہے۔ بلکہ نہیں کیا۔ پس اگر ہم درایت کو چھوڑ دیں۔ مثلاً بخاری و مسلم کی حدیثوں کو اس خیال سے کہ اس کے جمع کرنے والے نہایت بزرگ اور عالی درجہ تھے تسلیم کر لیں۔ اور بلا درایت کے مان لیں تو اس کے معنی یہ ہونگے۔ کہ ہم بجائے ابو حنیفہ اور مالک اور شافعی اور حنبل رحمہم اللہ کے امام بخاری اور امام مسلم کی تقلید کرتے ہیں۔ پس ہم کو اُن ائمہ کی تقلید میں کیا بُرائی تھی کہ اُن کو چھوڑ کر امام بخاری اور امام مسلم کی تقلید کرنے لگے۔ میں حدیث کا خصوصاً بخاری اور مسلم کی حدیثوں کا نہایت ادب کرتا ہوں مگر اُن پر درایت سے کام لینے کو ضروری خیال کرتا ہوں +

جو لوگ ایک ادنے حدیث کی بھی تحقیر کرتے ہیں۔ میں اُن کو نہایت نالائق سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ حدیث رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ہو۔

حدیث کی تحقیر کرنا دوسری چیز ہے۔ اور کسی حدیث کی نسبت یہ بات کہنا۔ کہ ہمارے نزدیک ثابت نہیں دوسری چیز ہے۔ اور لوگوں کا اختیار ہے کہ ہماری بات کو مانیں یا نہ مانیں۔ علمائے حدیث نے بھی حدیث کی تنقیح کے لئے بہت سے اصول درایت کے قائم کئے ہیں۔ مگر ان کو صحاح ستہ کی حدیثوں پر کام میں نہیں لاتے۔ ان کے سوا اور حدیثوں پر کام میں لاتے ہیں۔ مگر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انہیں اصولوں کو صحاح ستہ کی حدیثوں پر کیوں کام میں نہیں لاتے۔ آپ کا یہ تحریر فرمانا کہ میں بڑے بھاری رکن اسلام یعنی حدیث کو ڈھانا چاہتا ہوں۔ معاف کیجئے۔ یہ آپ کی غلطی ہے مگر احادیث کو مثل قرآن مجید کے بلاشبہ نہیں سمجھتا۔ محدثین رحمہم اللہ نے حدیث کے جمع کرنے میں جو کچھ محنت کی ہے۔ تمام مسلمانوں کو اُن کا شکرگذار ہونا واجب ہے۔ انہیں کی بدولت ہم اقوال و افعال رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے واقف ہوئے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم اس بات کی بھی تنقیح کریں کہ درحقیقت وہ قول یا فعل رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے یا نہیں۔ اگر ہم کو یقین ہو کہ درحقیقت وہ قول و فعل رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تو بغیر چوں و چرا کئے اُس کے آگے سر جھکا دیں +

جس شخص میں محبت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی جاگزین ہوگی۔ نہ زید و بکر کی وہ تو اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کا جو میں نے بیان کی +

غرضکہ جو مسئلہ آپ نے پوچھا ہے۔ وہ بہت عمیق اور غور طلب ہے۔ اور بہت زیادہ وسیع تقریر اس کے لئے چاہئے۔ ایسے مختصر خطوں میں اس کے لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ والسلام +

ولادت مسیح کے متعلق مولوی احمد بابا مخدومی لاہوری کا

سوال اور اُس کا جواب

لاہور نمبر ۵۲۱ مورخہ ۱۹ جولائی ۱۸۹۸ء

جناب منشی صاحب خدا آپ کی عمر میں برکت دے!

کچھ عرصہ ہُوا ہے کہ میں نے سید السادات اعنی سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ والغفران کی خدمت بابرکت میں جن کی وفات سے وہ صدمہ ہُوا ہے جس کا بیان قلم اور زبان سے ہونا مشکل ہے ایک خط روانہ کیا تھا۔ اُس کا جواب اُنہوں نے پشتِ خط پر لکھ بھیجا تھا۔

ایک مقدس مقولہ ہے کہ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا فَاَکْثَرَ ذِکْرَہٗ جس کو کوئی چیز پیاری لگتی ہے۔ وہ اکثر اُس کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ اسی بنا پر میں اُس خط کو مع جواب کے ذیل میں نقل کرکے متوصد ہوں کہ آپ اسے اخبار چودھویں صدی میں چھاپ کر نہ صرف میرا بلکہ اُن سب اصحاب کا جو سرسید مرحوم ومغفور کے طریق استدلال کو پسند رکھتے اور اُن کی قرآنی تفسیر کی میری طرح نہایت دل وجان سے قدر ومنزلت کرتے ہیں شکر گذاری کا موقع حاصل کرینگے۔ والسلام

وھوھذا

بارود خانہ۔ لاہور نمبر ۹۸ مورخہ ۲۹۔ جنوری ۱۸۹۸ء

حکیم امت سلمہٗ ربہٗ!

حضرت عیسےٰ اور یحییٰ کی پیدائش کا ذکر قرآن شریف میں باہم بیان ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران اور مریم کے دیکھنے سے یہ امر بخوبی واضح ہے اور لطف یہ ہے کہ الفاظ بھی یحییٰ اور عیسےٰ (علیہما السلام) کی بشارت وپیدائش کے بیان میں مماثل ومشابہ ہیں۔ میں یہاں ان آیات کو جن میں زکریا اور مریم کی بشارتوں اور یحییٰ اور عیسےٰ کی پیدائش کا ذکر ہے بالمقابل لکھتا ہوں:۔

زکریا کو بشارتیں

فنادته الملئکة وهو قائم یصلی فی المحراب ان اللّٰه یبشرك بیحیٰی مصدقا بکلمة من اللّٰه وسیدا وحصورا ونبیا من الصالحین ۰ قال رب انّٰی یکون لی غلام وقد بلغنی الکبر وامراتی عاقر - قال کذالك اللّٰه یفعل ما یشاء -

(آل عمران آیات ۳۴ و ۳۵)

کٓھٰیٰعٓصٓ - ذکر رحمة ربك عبده زکریا - اذ نادیٰ ربه نداء خفیا - قال رب انّٰی یکون لی غلام وکانت امرأتی عاقرا وقد بلغت من الکبر عتیا - قال کذلك قال ربك هو علیّ هیّن وقد خلقتك من قبل ولم تك شیئا ۰

(سورۂ مریم آیات ۱ تا ۹)

مریم کو بشارتیں

واذ قالت الملئکة یامریم ان اللّٰه اصطفٰك وطهرك واصطفٰك علیٰ نسآء العٰلمین یا مریم اقنتی لربك واسجدی وارکعی مع الراکعین ۰ اذ قالت الملئکة یا مریم ان اللّٰه یبشرك بکلمة منه اسمه المسیح عیسی ابن مریم وجیها فی الدنیا والاٰخرة ومن المقربین ۰ و یکلم الناس فی المهد و کهلا ومن الصالحین ۰

-- -- -- -- -- -- -- --

-- -- -- --- -- - قالت رب انّٰی یکون لی ولد ولم یمسسنی بشر - قال کذالك اللّٰه یخلق ما یشآء اذا قضیٰ امرا فانما یقول له کن فیکون - (آل عمران)

فارسلنا الیها روحنا فتمثل لها بشرا سویا - قالت انّی اعوذ بالرحمن ان کنت تقیا قالت انّی یکون لی غلام و لم یمسسنی بشر ولم اك بغیا - قال کذلك قال ربك هو علیّ هیّن ولنجعله اٰیة للناس ورحمة منا وکان امرا مقضیا - (سورۂ مریم)

عیسیٰ خود کہتا ہے	یحییٰ کو خدا کہتا ہے
انی عبد اللہ اتنی الکتاب وجعلنی نبیا۔ وجعلنی مبارکا این ماکنت واوصنی بالصلوۃ والزکوۃ مادمت حیا۔ وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا۔ وسلام علی یوم ولدت ولیوم اموت ولیوم ابعث حیا (مریم)	یٰیحییٰ خذ الکتاب بقوۃ و اتینٰہ الحکم صبیا۔ وحنانا من لدنا وزکوۃ وکان تقیا۔ وبرا بوالدیہ ولم یکن جبارا عصیا۔ وسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیا۔ (مریم)

مخطط سطور میں سے غور کرنے کے قابل یحییٰ کی نسبت الفاظ ہیں۔ برا بوالدیہ۔ اور حضرت عیسیٰ کہتے ہیں برا بوالدتی۔ اس اعتراض کا جواب کیا ہوگا۔ کہ اگر اُن کا باپ ہوتا تو والدہ کو متفرد نہ کرتے۔ اور کہتے برا بوالدی (یعنی نیکوکار اپنے باپ اور ماں کے ساتھ)

میں نے بہت دفعہ تفسیر القرآن کو غور سے پڑھا۔ ان الفاظ پر اُس میں بحث نہیں پائی۔ باقی آیتیں تو بیشک صاف ہیں۔ لیکن اس کا جواب بالضرور آپ کے ذمہ ہے

کئی برس گذرے ہیں یہی سوال میں نے ایک لائق اور صاحب تصانیف شخص سے کیا تھا۔ اور سوائے سکوت کے اُن سے کچھ بن نہ پڑا۔ ایسے ہی اور کئی مقام ہیں۔ جہاں میرا فہم اور ادراک عاجز ہے۔ اور آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی سچ ہے۔ کہ جناب کو نہایت ضروری کام اور بہت سے سرانجام کرنے ہوتے ہیں۔ مگر میں بھی فہم قرآن کے واسطے اس قدر بیتاب اور مشتاق ہوں کہ میرا دل ہی جانتا ہے

آج کل لاہور میں ایک مولوی صاحب جو پنجاب کے ایک کونے کے متوطن ہیں۔ بغرض چھپوانے تفسیر کے جس کو ساتھ ساتھ تالیف بھی کرتے جاتے ہیں۔ آئے ہوئے ہیں۔ بہ نسبت احادیث کے جس طرح عام غیر مقلدین (اجس لقب سے کہ یہ لوگ خوش ہوتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں عاملین بالحدیث) کا حال ہے یہ شخص بہت کچھ قرآن کی تعظیم کرتا اور قابل سند بتاتا ہے

میں ایک روز مع چند احباب کے اس کے دیکھنے کو گیا۔ اور بعض مقامات

قرآن کی تفسیر پوچھی۔ جن میں سے ایک مقام یہ تھا۔ ولقد همت به وهم بها لولا ان را برهان ربه (سورۂ یوسف) اس کے معنی مولوی صاحب نے مفسرین پر کلمات افسوس کہکر وہی کئے جو میں سمجھے ہوا ہوں۔ (ذٰلک فضل الله علیّ) یا یہ کہ قریب قریب جیسا کہ جناب نے تفسیر کی ہے +

زاں بعد ولادت مسیح پر گفتگو ہوئی۔ اس پر انہوں نے پرانا دقیانوسی خیال ظاہر کیا۔ غرض میں کل تو نہیں اگلے یکشنبہ کو اُن کے پاس جاؤنگا۔ چونکہ مجھے خود بھی برًّا بوالدیہ اور برًّا بوالدتی دل میں کھٹکتا ہے۔ لہذا مُصدعِ اوقات گرامی ہوں۔ کہ اس کا جواب بہت جلد تحریر کریں +

میرا خیال تھا۔ اور شاید ٹھیک بھی تھا۔ کہ بروقت تفسیر کرنے سورۂ مریم کے آپ ان الفاظ پر بحث کرینگے۔ چونکہ تفسیر کا چھاپا جانا ملتوی کیا گیا ہے میں اُمید کرتا ہوں۔ کہ آپ اس آیت کی تفسیر فرماکر اجر حاصل کرینگے + والسلام

میں ہوں آپ کا تابعدار اخلاص شعار

احمد بابا مخدومی لاہوری

جواب

جناب مخدومی!

حضرت عیسےٰ علیہ السلام تمام لوگوں میں ابن مریم کرکے مشہور تھے۔ اسی شہرت کے اعتبار سے قرآن مجید میں بھی ان کو ابن مریم سے تعبیر کیا ہے۔ بہت لوگ اسی طرح اپنی ماں کے نام سے مشہور ہوئے ہیں۔ پس قرآن مجید میں جس طرح ابن مریم کہا گیا ہے۔ برّا بوالدتی کہا ہے۔ اس لفظ سے یہ سمجھنا کہ ان کا کوئی باپ نہیں تھا۔ کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کیا سادات کو جو بنی فاطمہ کرکے مشہور ہیں۔ آپ بن باپ کا پیدا ہوا خیال فرماتے ہیں؟ والسلام

خاکسار

سید احمد۔ علی گڈھ۔ ۳۱۔ جنوری ۱۸۹۰ء

سوال

خدا نے یہ تمام کائنات کیوں اور کس مقصد سے پیدا کی؟

(سوال از دیوان سرشیر محمد خاں والئے پالن پور گجرات)

جواب

سوال جو پوچھا جاتا ہے اُس کا جواب دو طرح پر ہوتا ہے یا تو بتایا جاتا ہے۔ کہ یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے یا اُس کا جواب دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی یہ سوال کرے۔ کہ دس اور پانچ ملکر بیس کیوں ہوتے ہیں۔ تو اُس کو جواب دیا جائیگا۔ کہ یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے۔ اور اگر کوئی یہ سوال کرے کہ دس اور پانچ ملکر پندرہ کیوں ہوتے ہیں۔ تو اُس کا جواب دیا جائیگا۔ کہ پانچ دس کا نصف ہے۔ اور جب اس کو دس میں ملائیں۔ تو ڈیوڑھا ہو جاتا ہے۔ اور پندرہ بھی دس کا ڈیوڑھا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ پانچ کو دس میں ملائیں۔ تو پندرہ ہو جاتے ہیں۔ مگر جب کوئی شخص سوال کرتا ہے۔ تو اس بات پر بھی خیال کرنا ضرور ہوتا ہے۔ کہ یہ سوال انسان کے دل میں کیوں پیدا ہوا ہے۔ جب ہم اُس سوال پر خیال کرتے ہیں۔ جو پوچھا گیا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسانی مصنوعات کو جب انسان دیکھتا ہے۔ تو اُس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ کیوں اور کس مقصد سے بنائے گئے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کمہار نے ایک پیالہ بنایا تو انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ یہ کیوں بنایا ہے۔ اُس کا جواب دیا جاتا ہے کہ کسی چیز کے رکھنے کو یا کسی رقیق چیز کے پینے کو یہ سوال ایسی حالت میں درست ہوتا ہے۔ جب کہ اُس کے بنانے والے کی اور اُس کے بنانے کی حقیقت اور ماہیت معلوم ہو۔ لیکن اگر اُس کے بنانے والے کی اور اُس کے بنانے کی حقیقت اور ماہیت معلوم نہ ہو۔ تو اُس وقت یہ سوال درست نہیں ہوتا۔ بلکہ غلط ہوتا ہے۔ کیونکہ جو منشاء اس قسم کے سوال کا بنانے والے کے حالات معلوم ہونے سے انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ منشاء خدا کی نسبت صادق نہیں آتا۔ کیونکہ خدا کی اور اُس کی صنعت کی حقیقت اور ماہیت معلوم نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا جاننا فطرت انسانی سے خارج ہے۔ پس خدا کی اور خدا کے کاموں کی حقیقت اور ماہیت معلوم نہیں ہے۔

اور اسی لئے یہ سوال خدا کی نسبت کرنا درست نہیں ہے - بلکہ غلط ہے - پس اس جواب یہی ہے - کہ یہ سوال عقلاً نہیں ہو سکتا کہ خدا نے یہ تمام کائنات کیوں اور کس مقصد سے پیدا کی ہے - تو یہ سوال کے غلط ہونے کی عقلی دلیل ہے - لیکن اگر ہم مذہب کے رُو سے جواب دینا چاہیں - تو صرف ہم کو اس قدر کہنا کافی ہے - کہ خدا نے قرآن مجید میں فرما دیا - لا یسئل عمّا یفعل وھم یسئلون +

اگر ہم زیادہ عام فہم طور پر اس سوال کا جواب بیان کرنا چاہیں - تو یوں کہیں کہ کمہار جس نے مٹی کے کھلونے بنائے ہیں - کسی کو ہاتھی بنایا ہے - کسی کو گھوڑا - کسی کو شیر - کسی کو بکری - کسی کو بلی کسی کو چوہا - کسی کو لنگڑا - کسی کو لولا - تو کیا مٹی اُس سے پوچھ سکتی ہے - کہ تو نے ایسا کیوں کیا ہے - پس انسان کی کیا مجال ہے - کہ خدا کی نسبت ایسا سوال کر سکے +

ہاں خدا نے بہت جگہ قرآن مجید میں فرمایا ہے - کہ ہم نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے - کہ ہماری عبادت کرے - مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے - مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ - پس مسلمانوں کو اُس کے مطابق خدا کی عبادت جس طرح کہ خدا نے عبادت کا حکم دیا ہے - عبادت کرنی چاہیئے - اور اگر کوئی غیر مذہب والا جو قرآن مجید کو نہیں مانتا - اُس کی وجہ دریافت کرنی چاہے - تو ہم عقلاً بخوبی ثابت کر سکتے ہیں - کہ انسان کا نیچر جس پر خدا نے اس کو مخلوق کیا ہے - اُسی کا مقتضی ہے - مگر یہ بحث بہت طویل ہے - اور بقول ایک دانشمند شخص کے ٹیبل ٹاک[1] میں اُس کے بیان کی گنجائش نہیں +

---

[1] ٹیبل ٹاک (گفتگو) کھانا کھانے کے وقت کی گفتگو + (احمد بابا مخدومی)

استجابتِ دعا کی نسبت مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف اشارہ

(مرزا غلام احمد صاحب قادیانی۔ اور وہ فرقہ جس کو وہ نیچری کہتے ہیں)

مرزا صاحب نے جو اشتہار ۲۵۔جون ۱۸۹۷ء کو جاری کیا ہے۔ اُس میں لکھا ہے "کہ ایک فرقہ نیچریہ مسلمانوں کی گروش ایام سے پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ قبولیت دعا سے منکر ہیں"۔

ہم جناب مرزا صاحب سے عرض کرتے ہیں۔ کہ یہ خیال آپ کا صحیح نہیں ہے۔ جس کو آپ نیچریہ فرقہ بتاتے ہیں۔ وہ تو ہر ایک شخص کی دعا کے قبول ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے اور وہ یقین کرتا ہے۔ کہ خدا مستجاب الدعوات ہے۔ اور وہ ہر ایک بندے کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ مگر دعا کے قبول ہونے کا مطلب وہ یہ بتاتے ہیں۔ کہ اگر مسئول عنہ مقدر میں ہے۔ تو ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کا ہونا مقدر میں نہیں ہے۔ تو خدا دعا قبول کر کے دعا مانگنے والے کو ثواب آخرت دیتا ہے۔ مگر کسی کی دعا کو وہ رد نہیں کرتا۔ پس اُن کے عقیدہ کے موافق ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے۔ کسی کی دعا رد نہیں ہوتی۔ آپ کا یہ لکھنا۔ کہ یہ لوگ قبولیت دعا کے منکر ہیں۔ اس لائق ہے کہ اس پر کسی وقت خاص میں آپ دوبارہ غور فرما دینگے۔

ہمارے بعد ہمارا نام رہے گا

یہ ایک نہایت لغو اور بیہودہ خیال ہے۔ جس کا کچھ نتیجہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بہت لوگ اس لغو خیال میں مُبتلا ہیں۔ کوئی اولاد چاہتا ہے۔ کہ اُس کے بعد اُس کا نام چلے۔ کوئی محل بناتا ہے۔ کہ اُس کے بعد اُس کا نام قائم رہے۔ مگر ہم پوچھتے ہیں۔ کہ اس سے فایدہ کیا ہے؟ اگر اس کے بعد لوگوں نے کہا۔ کہ یہ قلعہ اکبر کا بنایا ہُوا ہے۔ اور وہ قلعہ شاہجہان کا۔ تو اُس سے مرنے والے کو کیا فایدہ! مرنے والا تو مرگیا۔ "اپنی کرنی اپنی بھرنی" اپنے ساتھ لے گیا۔ اب لوگ کچھ ہی کہا کریں۔ جو ہونی بات تھی وہ ہوگئی۔ سعدی فرماتے ہیں کہ ؎

زندہ ست نام فرخ نوشیرواں بعدل۔
گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند۔

اس شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ نوشیرواں کے بعد لوگ کہا کرتے تھے۔ کہ نوشیرواں بہت عادل تھا۔ مگر یہ نہ کھُلا۔ کہ اُس سے نوشیرواں کو کیا فائدہ ہُوا۔ پس لوگوں کو جو یہ تمنّا ہوتی ہے۔ کہ ہمارے بعد ہمارا نام قائم رہے یہ کیوں ہوتی ہے۔ اور اس سے اُن کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ ہمارے نزدیک تو یہ محض خیال خام ہے۔ اور انسان کے دل کے بودے پن کی دلیل ہے۔ انسان کو ہمیشہ یہ خیال رہنا چاہئیے۔ کہ میں کوئی ایسا کام کرجاؤں جس سے انسانوں کو۔ قوم کو۔ فائدہ پُہنچتا رہے۔ مثلاً کسی علم کا ایجاد کرنا۔ کسی ہُنر کا پیدا کرنا۔ یا کوئی ایسی بات ایجاد کرنا۔ جو لوگوں کو فائدہ مند ہو۔ یہ خیال بہت صحیح ہے۔ کیونکہ اپنی ذات کے واسطے نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ ذات بھی فنا ہوجائے۔ بلکہ زندہ لوگوں کے لئے ہے۔ اور ایسوں کے لئے ہے۔ جن کا سلسلہ برابر قیامت تک جاری رہیگا۔ پس ہمارے خیال میں اس سے زیادہ انسان کے لئے کوئی بےوقوفی نہیں ہے۔ جو یہ خیال کرے کہ میں ایسا کام کرجاؤں۔ جس سے میرے بعد میرا نام جاری رہے ؎

گذشتم از سرے مطلب تمام شد مطلب
حجاب چہرۂ مقصود بود مطلبہا

ہماری قوم

کیا اس سے آپ کی مراد سادات سے ہے؟ نہیں حضرت ان سے مراد ہے جو کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" پڑھتے ہیں۔ جو ہمارے دادا کی امت اجابت میں داخل ہیں۔ مگر "ہماری قوم" لکھ کر آپ چھپکے ہو رہے۔ نہ اس کا کچھ سر معلوم ہوا۔ نہ پاؤں۔ ہماری قوم سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ حضرت بات یہ ہے کہ کل ہمارے ایک دوست مولانا روم علیہ الرحمۃ کی مثنوی دیکھ رہے تھے۔ اس میں ایک عرب بدو کے کتے کی حکایت تھی۔ اس کو سن کر میرا خیال اپنی قوم پر گیا۔ دل نے کہا کہ ہماری قوم کا بھی یہی حال ہے۔ پھر دل نے کہا کہ نہیں۔ پھر کہا کہ ہاں۔ پھر کہا نہیں۔ پھر کہا ہاں۔ اس کا فیصلہ میں نہ کر سکا۔ اور اس کا خیال اب تک میرے دل میں ہے۔ اور بے ساختہ میری زبان سے نکل جاتا ہے کہ "ہماری قوم" پس جب تمہارے دل کی بھی وہی حالت ہو جو میرے دل کی ہے۔ اور تمہارے دماغ میں بھی وہ سب خیالات جمع ہو جاویں اور سما جاویں جو میرے دماغ میں ہیں۔ تو آپ کو بھی "ہماری قوم" کہہ اٹھنے کا مطلب معلوم ہو +

ہماری قوم سے مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم نے اپنے لئے کیا کیا۔ اور کیا کچھ کر سکتی ہے۔ اور کیوں نہیں کرتی +

یہ تو میں نے مانا کہ آپ کے دل میں جو قومی خیالات ہیں۔ وہ مثل مجذوبوں کے آپ کے منہ سے "ہماری قوم" کا لفظ نکلوا دیتے ہیں۔ مگر بدو عرب کے کتے کی حکایت سن کر بھی کبھی آپ نے کہا ہاں۔ کبھی آپ نے کہا نا۔ اور اسی تذبذب میں رہے کہ ہاں ٹھیک ہے یا نا۔ اس کا کیا سبب ہے؟

حضرت بات یہ ہے کہ میں نے اس زمانہ میں اپنی قوم کو نہایت خراب حالت میں دیکھا۔ جن پر ٹھیک یہ مثل صادق آتی ہے کہ:۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے
گئے دونو جہان کے کام سے ہم نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

قوم کی اس خراب حالت سے میرا دل دکھا۔ اور میں نے یقین کیا کہ تعلیم اور صرف تعلیم ہی ان کی خراب حالت کے درست کرنے کا علاج ہے +

میں نے ان کے لئے ایک مدرسۃ العلوم بنایا۔ مگر اس کا بننا اور چلنا صرف قوم کی

امداد پر منحصر تھا۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ قوم نے اس میں بہت کچھ مدد کی ہے۔ اور قوم ہی کی امداد سے ایسا عالیشان مدرسہ بہت کچھ بن گیا۔ مسجد مدرسہ کی بہت عمدہ و نفیس طیار ہو رہی ہے۔ اور جو کچھ اب تک ہوا ہے۔ وہ قوم ہی کی مدد سے ہوا ہے۔ تو میرے دل سے نا کا لفظ نکلتا ہے۔ مگر جب یہ خیال آتا ہے کہ پورے جوش اور پوری ہمدردی سے جیسی اس کام میں قومی مدد ہونی چاہئیے تھی ویسی نہیں ہوئی۔ تو میرے دل سے ہاں کا لفظ نکلتا ہے۔ پھر جب میں سوچتا ہوں کہ پنجاب کے مسلمانوں نے تو دلی ہمدردی کی ہے۔ اور نہایت دلی جوش سے امداد کی ہے اور زندہ دل ان کا خطاب ہو گیا ہے تو یہ خیال بے اختیار میرے دل سے نا نکلوا تا ہے +

پھر جب میں شمال مغربی اضلاع اودھ اور بنگال کا خیال کرتا ہوں۔ جنھوں نے کچھ بھی نہیں یا بہت ہی قلیل اس قومی کام میں مدد کی ہے۔ تو از خود ہاں کا لفظ بصد آہ و نالہ میری زبان پر آتا ہے +

علیگڈھ کے چند رئیسوں نے دل سے خواہ بمقتضاے ریاست امداد کی ہے جن کا میں دل سے شکر گذار ہوں۔ اور اس لئے دل میں آتا ہے کہ بجاے ہاں کے نا کہوں +

آج صبح کا وقت تھا۔ میں اسی خیال میں بیٹھا ہوا تھا کہ نا کہنا ٹھیک ہے۔ یا ہاں۔ کہ اتنے میں بگی کی گھڑ گھڑ کی آواز آئی۔ نوکر نے کہا کہ حاجی احمد سعید خاں صاحب رئیس بھیکم پور ہیں۔ وہ آئے اور پانسو روپیہ نقد امداد کالج کے لئے عنایت فرمائے۔ پھر تو میں نا نا دو دفعہ اور ہاں ایک دفعہ کہنے لگا +

غرضیکہ مختلف حالات پیش آتے ہیں۔ کبھی نا کہنے کو دل چاہتا ہے۔ اور کبھی ہاں کہنے کو۔ مگر میں تو ہاں ہی کہنے کا تصفیہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں اس قومی کام کے پورا ہونے کا اور قائم رہنے کا کسی میں ولولہ نہیں پاتا +

خیر یہ تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ نا کا تصفیہ کریں یا ہاں کا۔ مگر جب تک بدّو عرب کے کتّے کی کہانی نہ معلوم ہو اُس وقت تک نہ آپ کی نا کا مطلب سمجھ میں آتا ہے نہ آپ کی ہاں کا +

حضرت وہ کہانی یہ ہے کہ ایک بدّو عرب کا تھا اور ایک کُتّا اس کے پاس تھا۔ وہ سفر کر رہا تھا۔ اور کُتّا اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ مگر راستے کے کنارہ پر کُتّا گر پڑا اور بے حال ہو گیا۔ دم توڑنے لگا۔ اور قریب المرگ ہو گیا۔ بدّو اس کے پاس بیٹھا ہوا سر پیٹ رہا

تھا۔ اور زار و قطار رو رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ کہ میرے رفیق اب تو مجھ سے جدا ہونے کو ہے +

اتنے میں ایک اور مسافر اس راستہ سے گذرا اور بدو کا یہ حال دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور بدو سے کہا کہ تم اس قدر روتے دھوتے کیوں ہو۔ حال کیا ہے؟ اُس نے کتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ کہ یہ کتا میرا بڑا رفیق ہے۔ ساری رات میری چوکسی کرتا تھا۔ اور چوروں کو اور دشمنوں کو میرے پاس آنے نہیں دیتا تھا۔ دن کو شکار مار لاتا تھا۔ اور میرے آگے رکھ دیتا تھا۔ اور نہایت قانع تھا۔ اور جو لقمہ کہیں سے اس کو مل جاتا تھا وہی کھا لیتا تھا۔ اور صبر کرتا تھا۔ اور جو کچھ میں حکم کرتا تھا بجا لاتا تھا۔ اب اس کا یہ حال ہے۔ کہ دم توڑ رہا ہے۔ اور کوئی دم میں مرنے کو ہے +

مسافر نے کہا کہ کیا اس کو شکار کرنے میں کوئی ایسا زخم کسی درندہ جانور کا لگا ہے۔ جس کے سبب سے اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ بدو نے کہا نہیں نہیں! کوئی زخم نہیں لگا۔ مگر چند روز سے اس کو کھانا نہیں ملا۔ اور بھوک کے مارے مر رہا ہے۔ اور اب اس کے مرنے میں کچھ باقی نہیں +

اتنے میں اس مسافر کی نگاہ عرب کے اسباب پر پڑی۔ اُس کی زنبیل میں بہت سا کھانا بھرا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ تمہارے پاس تو بہت سا کھانا ہے۔ تم نے اس میں سے اس کُتے کو کیوں نہیں دیا۔ بدو نے کہا کہ واہ یہ تو میری زاد راہ ہے۔ مسافرت میں اس میں سے کھاتا ہوں۔ اور اپنی زندگی بسر کرتا ہوں۔ اگر اس میں سے میں اپنے کُتے کو دیدوں تو میں کیا کھاؤں +

مسافر نے کہا تم رویا کرو۔ تمہاری قسمت میں رونا ہی لکھا ہے۔ یہی حال ہماری قوم کا ہے۔ قوم کے تباہ حال پر روتے اور افسوس تو بہت کرتے ہیں۔ مگر اس کی امداد کچھ نہیں کرتے۔ اپنی زنبیل میں بہت کچھ بھر رکھتے ہیں۔ مگر کُتے کے ٹکڑا نہیں دیتے۔ اور اس کے بھوکے مرنے پر روتے ہیں +

اسی سبب سے تو میں کبھی اپنی قوم کی نسبت کہتا ہوں۔ ہاں یعنی اس بدوی کا سا قوم کا حال ہے۔ اور کبھی کچھ ان کی ہمدردی دیکھ کر کہتا ہوں کہ نا۔ مگر اخیر کو تصفیہ ہاں ہی ہاں کرنا پڑتا ہے۔ خدا ان کو توفیق دے۔ کہ سب لوگ بقدر اپنی حیثیت کے قوم کی مدد کریں۔ اگر ایسا کریں تو جو خراب حال قوم کا ہے وہ چند روز میں بدل جاوے اور قوم کو قوم کی حالت پر رونا نہ پڑے +

غیر مذہب کے پیشواؤں کا ہم کو ادب کرنا چاہیئے

ہم کو نہایت افسوس ہے۔ کہ جب ہم مذہبی مباحثوں کی کوئی کتاب دیکھتے ہیں۔ تو اُس میں ایک مذہب والا دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا بُری طرح پر ذکر کرتا ہے۔ یہ امر مذہب اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ جس مذہب کے جو پیشوا ہیں۔ جب ہم اپنے مذہبی مباحثوں میں اُن کا ذکر کریں۔ تو ہم کو لازم ہے۔ کہ اُن کو بُرا نہ کہیں۔ بلکہ ادب و تعظیم سے اُن کا ذکر کریں۔ خواہ وہ لوگ ہندو ہوں۔ یا پارسی۔ عیسائی ہوں یا یہودی یا خود مختلف عقائد کے مسلمان ہی ہوں۔ اگر ہم اُن کے بزرگوں و پیشواؤں کے ساتھ گستاخی سے پیش آئینگے۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ اسی طرح ہمارے بزرگوں اور پیشواؤں کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی سے پیش نہ آئیں۔ اس لئے خدا تعالےٰ نے ہم کو حکم دیا ہے۔ کہ لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبو اللہ عدوا بغیر علم (سورۂ انعام آیت ۱۰۸)

یعنی مت بُرا کہو اُن کو جو خدا کے سوا اور کسی کی عبادت کرتے ہیں۔ پھر وہ بڑھ کر نادانستگی سے خدا کو بُرا کہینگے۔ پس حقیقت میں غیر مذہب والوں کے پیشواؤں کو بُرا کہنا خود اپنے مذہب کے پیشواؤں کو اُن سے کہلوانا ہے۔ جس کا گناہ انہیں پر ہوتا ہے۔ جنہوں نے غیر مذہب کے پیشواؤں کو بُرا کہا ہے۔ علاوہ اس کے اخلاق اور متانت سے نہایت بعید ہے۔ کہ ہم کسی مذہب کے پیشوا کا بے ادبی سے ذکر کریں۔ واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم

منتہی الکلام فی بیان مسائل الاسلام

جو لوگ مذہب اسلام کی مخالفت اور اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ان کتابوں پر متوجہ ہوتے ہیں۔ جو کتب احادیث و تفاسیر و کتب سیر کے نام سے مدون ہیں۔ اور جن کو خود اہل اسلام نے لکھا ہے۔ اور جب کوئی مسلمان ان احادیث کی تنقیح کرتا ہے۔ اور کسی کو مقبول اور کسی کو مردود قرار دیتا ہے یا تفاسیر اور سیر کی کتابوں کے مضامین کو غلط ٹھیراتا ہے۔ تو اُس پر مذہب اسلام کی طرفداری کا الزام لگاتے ہیں +

وہ کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا کتابوں میں ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو

(۱) خود قرآن مجید کے بھی برخلاف ہیں اور

(۲) ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو تاریخ محققہ اور مشہورہ کے متناقض ہیں۔ اور

(۳) ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کو حس اور مشاہدہ جھٹلاتا ہے اور

(۴) ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کو عقل انسانی کسی طرح قبول نہیں کرتی۔ اس قسم کی روایتوں سے جو مسلمان انکار کرتے ہیں۔ اور اُن کو غلط ٹھیراتے ہیں۔ اس سے اُن کا صاف مطلب یہ پایا جاتا ہے۔ کہ قرآن مجید کی صداقت ظاہر کرنے کو اس کے مخالف جو حدیثیں اور روایتیں ہیں۔ اس سے انکار کریں اور تاریخ محققہ اور مشہورہ اور حس اور مشاہدہ اور عقل انسانی کے برخلاف جو حدیثیں اور روایتیں ہیں۔ اس سے اس لئے انکار کرتے ہیں کہ مذہب اسلام پر کوئی حرف نہ آنے پائے اور تعجب یہ ہوتا ہے کہ

(۵) ایسی حدیثوں اور روایتوں کو جن سے بانئے اسلام کے مناقب پائے جاویں تسلیم کرتے ہیں۔ اور جن سے بانئے اسلام پر کسی قسم کی منقصت لازم آتی ہے۔ اس کو نہیں مانتے +

(۶) اور جو حدیثیں اور روایتیں وقار نبوت کے برخلاف ہیں اُن کو بھی نہیں مانتے اور کوئی عقلی دلیل اس بات کی نہیں بیان کر سکتے کہ کیوں ان حدیثوں اور روایتوں کو مانا ہے۔ اور کیوں ان روایتوں اور حدیثوں کو نہیں مانا۔ مگر اس ماننے اور نہ ماننے کی بنا عقائد مذہبی پر ہے۔ تو وہ شخص جو مذہب اسلام کو نہیں مانتا قبول نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان کے ماننے اور نہ ماننے کے لئے ایسی عقلی اور روشن دلیل چاہیئے۔ جس کو غیر مذہب والا بھی مان سکے +

یہ قول تو مخالفین مذہب اسلام کا ہے۔ مگر ہم اس پر یہ اور زیادہ کرتے ہیں کہ جب

کسی راوی کی ایک روایت یا کسی حدیث کی کتاب کی کوئی حدیث یا کسی محدث یا مفسر یا عالم یا مجتہد کے قول کو صحیح مانا جاتا ہے۔ تو جب اسی راوی کی دوسری روایت یا اسی حدیث کی کتاب کی دوسری حدیث یا اسی مفسر یا محدث یا عالم یا مجتہد کے دوسرے قول کو غلط قرار دیا جاتا ہے۔ تو خود مسلمان ہی معترض ہوتے ہیں۔ کہ کیوں اس راوی کی روایت اور اس حدیث کی کتاب کی حدیث کو اور اسی محدث یا مفسر یا عالم یا مجتہد کے قول کو صحیح مانا تھا اور اب کیوں اسی راوی کی روایت اور اسی حدیث کی کتاب کی حدیث اور اس محدث یا مفسر یا عالم یا مجتہد کے دوسرے قول کو غلط مانا جاتا ہے +

ہم ان امور کی نسبت جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی بنیاد عقائد مذہبی پر رکھنی نہیں چاہتے۔ بلکہ ایسے عام واقعات پر مبنی کرنا چاہتے ہیں۔ کہ جن سے ہماری دانست میں کوئی انسان انکار نہیں کر سکتا +

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جو واقعہ کسی زمانہ میں گذرتا ہے بشرطیکہ وہ واقعہ ایسا ہو کہ آئندہ زمانہ کے لوگ اس کے تذکرہ میں مشغول رہتے ہوں۔ اور اس کا چرچا قائم رکھتے ہوں۔ تو جس قدر زمانہ گذرتا جاتا ہے۔ اسی قدر اس میں زائد باتیں جو اس واقع میں درحقیقت نہیں ہوئیں ملتی جاتی ہیں۔ دنیاوی واقعات میں ایسا کم ہوتا ہے بلکہ نہیں ہوتا۔ کہ آئندہ زمانہ کے لوگ مدت دراز تک اس کے تذکرے اور چرچے میں مشغول رہتے ہوں۔ اور یہی سبب ہے کہ تاریخانہ واقعات میں جو بادشاہوں اور سلطنتوں اور ملکوں کے حالات میں لکھے جاتے ہیں۔ ایسی زائد اور بے اصل باتوں کا میل کمتر ہوتا ہے۔ مگر واقعات مذہبی ایسے قسم کے ہوتے ہیں۔ جن کا تذکرہ اور چرچا زمانہ دراز تک قائم رہتا ہے۔ بلکہ برابر چلا جاتا ہے۔ اس لئے زائد اور بے اصل باتیں ان واقعات میں شامل ہوتی جاتی ہیں۔ مذہب اسلام بھی اس عام قاعدہ سے بری نہیں رہا۔ بلکہ اس میں ایسے اسباب پیش آئے کہ اس میں زائد اور بے اصل باتوں کے شامل ہونے کے زائد اسباب تھے +

رسول خدا (صلے اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد جہاں تک ان واقعات کا جو آنحضرت کے زمانہ میں گذرے۔ اور ان اقوال و افعال کا جو آنحضرت ؐ نے فرمائے یا کئے سب کا زبانی روایتوں پر مدار تھا۔ اور اس میں زائد بے اصل باتوں کے شامل ہونے کے بہت سے اسباب موجود تھے +

اول۔ امتداد زمانہ ہی اس بات کا مقتضی تھا کہ زائد اور بے اصل باتیں اس میں شامل ہوتی جاویں +

دوم۔ ان باتوں کو گو وہ زائد اور بے اصل ہی ہوں۔ لوگ زیادہ پسند کرتے تھے۔

جن سے تقدس اور تفوق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا مترشح ہوتا تھا +

سوم - جو راوی اس زمانہ کے واقعات کو یا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو روایت کرتے تھے - وہ نہایت مقدس معزز و مکرم لائق ادب سمجھے جاتے تھے - جس نے بہت لوگوں کو صحیح و غلط روایت کرنے پر اور موضوع و بے اصل روایت بنا لینے پر راغب کیا تھا +

چہارم - راویوں کا اُن واقعات کے اسباب کے سمجھنے میں جن کے سبب سے وہ واقعات پیش آئے تھے غلطی کرنا اور اس کا ایسا سبب قرار دینا جو واقعی نہ تھا +

پنجم - آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا - اس کے مطلب اور مقصد اور منشار کے سمجھنے میں غلطی کرنا اور اس کا ایسا مطلب قرار دینا جو مقصود نہ تھا +

ششم - آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پوری بات سُنی بغیر صرف اسی قدر کو روایت کر دینا جس قدر کہ ادھوری بات سُنی تھی +

ہفتم - آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم یہودیوں اور عیسائیوں اور عرب جاہلیت کے حالات اور عقائد یا واقعات کا بھی تذکرہ فرمایا کرتے تھے - مگر سننے والے نے یہ سمجھا کہ ان باتوں کو خود رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے - اور اس کو آنحضرت کے فرمودہ کے طور پر روایت کر دیا +

ہشتم - ایک غلط افواہ کا لوگوں میں مشہور ہو جانا - اور پھر اس کا بطور روایت کے بیان ہونا +

نہم - آپس میں تنازعات کا ہونا - اور ہر ایک گروہ کا اپنے مقصد کے موافق روایتوں کا بنانا - اور روایت کرنا +

دہم - مختلف عقائد پر لوگوں کا ہو جانا - اور اپنے اپنے عقائد کی تائید میں روایتوں کا بیان کرنا +

یازدہم - بد دیانت لوگوں کا امراء و سلاطین کے خوش کرنے کو جھوٹی روایتوں کا بیان کرنا +

دوازدہم - منافقین اور مخالفین مذہب کا جھوٹی روایتوں کو شائع کرنا - یا اصلی روایتوں میں کمی بیشی کر دینا +

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک مدت دراز تک زبانی روایت کا سلسلہ جاری رہا - اور اُس وقت منقطع ہوا - جب کہ معتد بہ کتابیں حدیث کی لکھی

گئیں۔ مگر اس بات کو فراموش کرنا نہیں چاہئے کہ جس قدر حدیث کی کتابیں لکھی گئیں ان کی بنیاد اُنہیں زبانی روایتوں پر مبنی تھی +

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ محدثین نے خدا ان پر رحمت کرے جہاں تک کہ اُن سے ہو سکا۔ کسی نے کم اور کسی نے بہت زیادہ اس بات میں کوشش کی کہ صحیح روایتوں کو اپنی کتاب میں جمع کریں۔ چنانچہ موطا امام مالک اور بخاری و مسلم نے اور اس کے بعد ترمذی، سُنن ابو داؤد، سُنن نسائی اور ابن ماجہ نے اس میں بہت کامیابی حاصل کی اور علمائے ان کتابوں کو قبول کیا۔ اور ان کی شروح لکھنے اور مقامات مشکلہ کے حل کرنے میں متوجہ ہوئے +

ان کی کوشش کا زیادہ تر بلکہ بالکلیہ راویوں کے معتبر اور نامعتبر ہونے پر مدار تھا۔ مگر جن لوگوں کو مرے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا تھا ان کے معتبر یا نا معتبر ہونے کو اس طرح پر تحقیق کرنا جس پر یقین کامل ہو۔ اگر ناممکن نہ تھا تو نہایت مشکل ضرور تھا۔ مگر اس حدیث کے مضامین کے لحاظ سے اس کے صحیح یا غیر صحیح ہونے پر اُن لوگوں کو کچھ خیال نہ تھا +

اس زمانہ میں جس قدر مذاہب موجود تھے کیا یہودی اور کیا عیسائی اور کیا آتش پرست اور کیا بت پرست سب کے سب سپر نیچرل یعنی مافوق الفطرت واقعات کے واقع ہونے کے قائل تھے اور یہودی اور عیسائیوں میں ایسے واقعات کثرت سے مشہور تھے۔ اور مسلمان خدا کو قادر مطلق یقین کرتے تھے۔ جس سے اُن کا یہ مقصد تھا کہ خدا ایسے امور کے کرنے پر بھی مختار ہے جو مافوق الفطرت ہوں۔ اس لئے جو روایتیں اور حدیثیں ایسی ہوتی تھیں۔ جن میں واقعات مافوق الفطرت کا بیان ہوتا تھا۔ ان کو بلا کسی شبہ اور تردد کے حدیث کی کتابوں میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ غرضیکہ تمام کتب احادیث اور بالتخصیص کتب تفاسیر اور سیر اس قسم کی روایات کا مجموعہ ہیں۔ جن میں صحیح اور غیر صحیح اور قابل تسلیم اور ناقابل تسلیم حدیثیں اور روایتیں مندرج ہیں +

یہ سب باتیں جو ہم نے بیان کیں تاریخانہ واقعات ہیں جو اسلام پر گذرے ہیں۔ اور کوئی بات اس میں ایسی نہیں ہے کہ سوائے معتقدین اسلام کے اور کوئی اس کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ کوئی شخص کسی مذہب کا ہو۔ بشرطیکہ وہ تاریخی واقعات سے واقف ہو۔ اِن واقعات کے صحیح ہونے سے انکار نہیں کر سکتا +

اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایک محقق کو جو یہ چاہتا ہو کہ ان حدیثوں اور روایتوں میں سے صحیح کو غیر صحیح سے تمیز کرے عقلاً بغیر پابندی مذہب کے کیا کرنا لازم ہے؟ عقل یہ حکم

کرتی ہے کہ سب سے اول اس کا یہ کام ہوگا۔ کہ اسی زمانہ کی ایسی تحریر کو تلاش کرے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہو لکھا ہو۔ تاکہ اُس سے اُن زبانی روایتوں کا مقابلہ کرے۔ اور جس زبانی روایت کو اس تحریر کے مخالف یا متناقض پاوے۔ اس کو غلط قرار دے۔

ایسی تحریر بجز اس کتاب کے جس کو مسلمان قرآن مجید کہتے ہیں اور کوئی نہیں ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید اس زمانہ کے رواج کے موافق لکھا جاتا تھا۔ اور وہ متفرق چیزوں پر لکھا ہوا تھا۔ بعد انتقال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں ایک جا جمع ہوا جس میں بہت سے اقوال اور احکام رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے اور چند واقعات جو اس زمانہ میں واقع ہوئے مندرج ہیں۔ نعوذ باللہ اس کو کتاب منزل من اللہ نہ مانو۔ مگر کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ کہ وہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور کم سے کم یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ پس اگر کوئی زبانی روایت جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہو۔ اور اس کتاب کے اقوال اور احکام اور واقعات مندرجہ کے خلاف یا متناقض ہو۔ تو بلا لحاظ مذہب عقل اس بات کی مقتضی ہے کہ اس زبانی روایت کو غلط سمجھا جاوے اور مذہب اسلام میں سے اس کو اسی طرح نکال کر پھینک دیا جاوے۔ جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دیجاتی ہے۔ اور یہی عقلی اصول مذہب اسلام میں ٹھیرا ہے۔ کہ جو حدیث یا روایت قرآن مجید کے برخلاف یا اس کے متناقض ہو۔ اس کو نامقبول اور مردود کیا جائے پس ہمارا ایسا کرنا اس مطلب سے نہیں ہے۔ کہ قرآن مجید کی صداقت میں (جو ہمارے نزدیک بلا شبہ صادق ہے) کچھ فرق نہ آوے۔ بلکہ ہر انسان ایسا ہی کریگا جیسا کہ ہم کرتے ہیں۔

ایسا کرنے میں ہم نے قرآن مجید کے ساتھ کوئی عجیب کام نہیں کیا۔ بلکہ ایسا ہی کام کیا ہے۔ جو عموماً ایسی حالت میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے پاس تزک تیموری۔ تزک بابری تزک جہانگیری۔ جو خود ان بادشاہوں کی لکھی ہوئی ہیں یا ایسی تاریخیں جو ہم عہد مصنفوں نے لکھی ہیں موجود ہیں۔ اب ہم کو ایک زبانی روایت پہنچی۔ جو بالکل مخالف یا متناقض اُن حالات کے ہے جو ان کتابوں میں مندرج ہیں۔ تو ہم بلاشبہ اس زبانی روایت کو غلط اور مردود قرار دینگے۔ پس کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کے مقابلہ میں ایسی زبانی حدیث یا روایت کو جو قرآن مجید کے مخالف یا متناقض ہے۔ مردود اور نامقبول نہ قرار دیں۔ پس یہ خیال کہ ہم قرآن مجید کی صداقت قائم رکھنے کو اُن زبانی روایتوں سے انکار کرتے ہیں۔ کیسا لغو اور بیہودہ اور بے اصل

خیال ہے +

دوسرے امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں تو کوئی ایسی بات جو تاریخ محققہ اور مشہورہ کے برخلاف ہو۔ پائی نہیں جاتی۔ ہاں اس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ بعض قصص جو یہودیوں اور عیسائیوں میں یا عرب جاہلیت میں مشہور تھے۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے مگر جو فضول اور زائد اور بے اصل باتیں اُن قصص مشہور میں شامل تھیں۔ اور جو عقلاً بھی غلط معلوم ہوتی تھیں۔ وہ قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ گو کہ مفسروں نے اپنی تفسیروں میں اُن کو بھی داخل کر لیا ہو +

باقی رہیں وہ حدیثیں اور روایتیں جو زبانی بیان پر مبنی ہیں۔ اگر کسی تاریخ محققہ کے برخلاف ہیں۔ تو یہ برخلافی اُن کے نامعتبر ہونے کی دلیل کافی ہے۔ اور وہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے منسوب کی گئی ہیں۔ تو اول اس بات کا کافی ثبوت ہونا چاہئے۔ کہ درحقیقت اس کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ دوم اس بات کا ثبوت چاہئے۔ کہ جو لفظ راویوں نے بیان کئے ہیں۔ وہی لفظ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے تھے۔ تیسرے اس بات کا ثبوت چاہئے۔ کہ جو معنی ان لفظوں کے شارحین ومفسرین نے بیان کئے ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی معنی ان کے نہیں ہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک امر بھی نہیں ہے تو اس روایت کو رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث قرار دینا صحیح نہیں ہے +

تیسرے امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ ہم کو کوئی ایسی حدیث جس کو صحیح طور پر حدیث رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کہہ سکیں معلوم نہیں ہے۔ جو حس اور مشاہدہ کے برخلاف ہو۔ اور اگر کوئی روایت ایسی ہو اور اُس کو رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم سے نسبت کیا ہو۔ تو جب تک وہ تینوں امر ثابت نہ ہوں جن کا ابھی ہم نے بیان کیا ہے اُس وقت تک اُس کو حدیث رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نہیں کہہ سکتے۔ پس یہ خیال کرنا کہ ایسی روایتوں سے ہمارا انکار کرنا اس لئے ہے۔ کہ مذہب اسلام پر کوئی حرف نہ آنے پائے کس قدر غلط اور ناواجب ہے +

چوتھے امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ حدیث کی کتابوں میں ایسی حدیثیں مندرج ہیں۔ جو عقل انسانی کے برخلاف یا مافوق الفطرت ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے۔ کہ وہ لوگ واقعات مافوق الفطرت کے واقع ہونے کو تسلیم کرتے تھے۔ جیسا کہ اور تمام مذاہب کے معتقد بھی اس کو تسلیم کرتے تھے۔ پس یہ اعتراض ایسا عامتہ الورود ہے۔ کہ کوئی شخص جو کسی مذہب کا معتقد ہو۔ خواہ یہودی مذہب کا یا عیسائی مذہب کا یا اور کسی مذہب کا اس اعتراض سے بچ نہیں سکتا۔ لیکن جب کوئی محقق بنظر تحقیق ان پر نظر ڈالتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ کہ اُن کا

مافوق الفطرت یا خلاف عقل ہونا اس کے نامعتبر اور ناقابل ہونے کو کافی ہے +

خود علماے علم حدیث نے احادیث موضوع کے امتیاز کرنے کو جو قاعدے بنائے ہیں۔ اُن میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جس حدیث میں ایسے امور مذکور ہوں جو مافوق الفطرت یا خارج از عقل ہوں۔ تو وہ حدیث نامعتبر اور موضوع ہے۔ مگر محدثین اس قاعدہ کو ان حدیثوں پر جاری نہیں کرتے جو کتب مشہور احادیث میں اور خصوصاً اُن سات کتابوں میں مندرج ہیں۔ جن کے نام اوپر بیان ہوئے ہیں۔ مگر ایک محقق اس بات کی کوئی وجہ نہیں پاتا۔ کہ کیوں اس قاعدہ کو ان حدیثوں کی کتابوں پر جاری نہ کیا جاوے۔ اگر ان امور سے قطع نظر کیجاوے تو انہیں تینوں باتوں کا ثبوت درکار ہوگا جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ یعنی یہ کہ درحقیقت اُس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اور جو لفظ راویوں نے بیان کئے ہیں وہی لفظ رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے اور جو معنی ان لفظوں کے شارحین اور مفسرین نے اختیار کئے ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی معنی ان لفظوں کے نہیں ہیں۔ اگر ان میں سے پہلی دو باتیں ثابت نہ ہوسکیں تو اس کو حدیث رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اگر تیسری بات ثابت نہ ہو سکے تو محقق ان معنوں کا پابند نہیں ہوسکتا۔ جو شارحین اور مفسرین نے قرار دیئے ہیں۔ پس ایسی حدیثوں سے انکار کرنے پر یہ کہنا کہ اس لئے ان سے انکار کیا گیا ہے۔ کہ مذہب اسلام پر کوئی حرف نہ آنے پاوے۔ کیسا غلط اور بے جا اعتراض ہے +

پانچویں امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ جن حدیثوں یا روایتوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مناقب بیان ہوتے ہیں۔ وہ خود تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں ہوتا۔ صحابہ کے اقوال ہوتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور آنحضرت صلّے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے ہیں پس جو کچھ اُن میں بیان ہؤا ہے وہ رائے اُن بیان کرنے والوں کی ہے۔ پس کسی کو حق نہیں ہے کہ یہ کہے کہ یہ رائے اس بیان کرنے والے کی نہیں ہے۔ اور اس لئے ضرور ہے کہ وہ حدیثیں بطور اس راوی کی رائے کے تسلیم کی جاویں +

حدیث یا تفسیر یا سیر کی کتابوں میں ہم کوئی روایت ایسی نہیں پاتے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ منقصت کی ہو۔ یا کسی شخص نے جو آنحضرت کی رسالت اور اسلام کی حقیقت کا مقر ہو ایسی روایت بیان کی ہو۔ اور اس لئے یقین ہوتا ہے۔ کہ ایسی روایت کا بیان کرنا صرف دو شخصوں کا کام ہے یا منافقوں کا یا کافروں کا۔ اور ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں بسبب نفاق اور کفر کے جو مورث عداوت ہے کہتے ہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ اُس کو مردود سمجھا جائے۔ ایسا کرنے میں ہم قاعدہ طبیعت انسانی سے کچھ زیادہ نہیں کرتے۔ کیونکہ اس زمانہ میں بھی اگر کوئی

کسی کا دشمن یا مخالف اس کی نسبت کوئی بات منقصت کی کہتا ہے تو اس کو نہیں مانا جاتا۔ اور یقین کیا جاتا ہے۔ کہ دشمنی اور عداوت کی وجہ سے کہتا ہے پس ایسی بات کے تسلیم نہ کرنے میں ہم عام طبیعت انسانی سے کچھ زیادہ نہیں کرتے +

چھٹے امر کی نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ ہاں ہم ایسی روایتوں کو بھی نہیں مانتے۔ جو وقارِ نبوّت کے برخلاف ہوں۔ ایسا کرنے میں بھی ہم عام طبیعت انسانی کے برخلاف نہیں کرتے۔ کیونکہ ہم نے بہت سی قطعی دلیلوں سے آنحضرت صلّے اللہ علیہ وسلّم کو افضل ترین خلق تسلیم کر لیا ہے اور رسول خدا بھی مانا ہے تو ایسے امور کو جو اُس وقار کے برخلاف ہوں۔ ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔ ایسا کرنے میں بھی ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتے جو عموماً کیا کرتے ہیں۔ اِس زمانہ میں بھی جس شخص کو ہم عمدہ خصلت اور صاحب دیانت ذی وقار سمجھ لیتے ہیں تو اگر کوئی شخص ایسا امر بیان کرے جو اس کے وقار کے شایاں نہ ہو۔ تو اُس کو بھی ہم تسلیم نہیں کرتے۔ پس اگر ہم نے رسول مقبول صلّے اللہ علیہ وسلّم کی نسبت بھی ایسا کیا تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے +

محدثین نے حدیث کے روایت کرنے میں تین لفظ اختیار کئے ہیں۔ اخبرنا۔ اور انبانا۔ اور عن پہلے دو لفظ تو اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ کہ پچھلے راوی نے پہلے راوی سے خود وہ روایت سُنی ہے۔ مگر عن کے لفظ سے یہ لازم نہیں ہے۔ کہ پچھلے راوی نے پہلے راوی سے وہ روایت سُنی ہو۔ اور ممکن ہے کہ نہ سُنی ہو۔ بلکہ اس پچھلے راوی اور اس کے اوپر کے راوی میں اور لوگ بھی ہوں۔ جن کے نام چھوٹ گئے ہوں۔ اور ایسی بھی حدیثیں ہیں۔ جن کی روایت آنحضرت صلّے اللہ علیہ وسلّم تک نہیں پہنچی۔ بلکہ صرف صحابہ یا تابعین اور تبع تابعین تک پہنچی ہے۔ اگر ایسی حدیثوں میں ایسے مضمون ہوں جن پر کوئی جرح وقدح نہیں ہو سکتی۔ یعنی ازروئے درایت کے وہ مضمون غلط نہیں معلوم ہوتے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان حدیثوں کے قبول کرنے سے انکار کریں +

تفسیروں اور سِیَر کی کتابوں میں خواہ وہ تفسیر ابن جریر ہو یا تفسیر کبیر وغیرہ اور خواہ وہ سیرۃ ابن اسحٰق ہو خواہ سیرت ابن ہشام اور خواہ وہ روضۃ الاحباب ہو یا مدارج النبوۃ وغیرہ ان میں تو اکثر ایسی لغو اور نامعتبر روایتیں اور قصے مندرج ہیں جن کا نہ بیان کرنا ان کے بیان کرنے سے بہتر ہے +

ازواج مطہرات[51]

رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کے حالات اور جو مختلف روایتیں اُن کی نسبت ہیں۔ وہ سب کتب سیر و تواریخ میں مندرج ہیں۔ ہم بہت سی روایتوں کی نسبت بتا سکتے ہیں کہ محض غلط اور نامعتبر ہیں۔ مگر تین امر ایسے ہیں۔ جن کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا +

اول یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کثیر الازواج تھے +

دوم یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گیارہ ازواج طاہرات اور ایک یا دو سرایا[52] تھیں۔ اور حضرت خدیجہ سب سے پہلی زوجہ مطہرہ تھیں اور جب تک وہ زندہ رہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی دوسری کو اپنی زوجیت میں داخل نہیں کیا +

سوم یہ کہ بعد وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نو بیویاں زندہ تھیں۔ صرف حضرت عائشہ رض ایسی تھیں جن کا پہلے پہل آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقد ہوا تھا۔ باقی ایسی تھیں کہ جنہوں نے پہلے اور شوہر کر لئے تھے اور اُن شوہروں کی وفات کے بعد بحالت بیوہ ہونے کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقد کیا تھا +

اُن گیارہ ازواج مطہرات کے اور اُن دو سرایا کے نام حسب تفصیل ذیل ہیں:-

(۱) خدیجہ رض بنت خویلد (۲) سودہ رض بنت زمعہ (۳) عائشہ رض بنت ابوبکر رض (۴) حفصہ رض بنت عمر رض۔ (۵) زینب بنت خویمہ ام المساکین (۶) زینب رض بنت جحش (۷) اُم حبیبہ رض بنت ابی سفیان (۸) اُم سلمہ رض بنت ابی امیہ (۹) میمونہ رض بنت الحرث (۱۰) صفیہ رض بنت حیی ابن اخطب۔ (۱۱) جویریہ بنت الحرث +

سرایا (۱) ماریہ رض قبطیہ (۲) ریحانہ رض بنت شمعون۔ مگر ہماری رائے میں ریحانہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مقاربت نہیں کی +

---

[51] یہ مضمون اس سے پہلے مضمون کا دوسرا حصہ ہے۔ اگر پورا ہو جاتا تو سورۂ نور اور سورۂ تحریم کے بڑے ضروری مقامات کی تفسیر ہو جاتی۔ اس میں اُمہات المومنین خدیجہ۔ سودہ۔ حفصہ۔ اُم حبیبہ۔ اُم سلمہ۔ زینب اُم المساکین اور زینب بنت جحش کا حال قلمبند کیا ہے۔ مگر از حد افسوس ہے۔ کہ جنابہ عائشہ اور ماریہ قبطیہ کا حال لکھنا رہ گیا۔ اور یہی بڑا ضروری حصہ ہے جس پر منکرین اسلام اعتراض کرتے ہیں + احمد یا مخدومی

[52] لونڈیاں۔ سریہ واحد (احمد مخدومی)

ان کے سوائے جو اور روایتیں ہیں۔ اور جن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی سے عقد کرنا اور کسی کو بغیر مقاربت کے چھوڑ دینا یا کسی سے خطبہ یعنی منگنی کرنا وغیرہ بیان ہؤا ہے۔ اُن میں سے ایک روایت بھی اس قابل نہیں ہے کہ اُس پر پورا اعتماد کیا جائے۔ کیونکہ اُن روایتوں کی صحت ثابت نہیں ہوتی۔ اہل سیر تمام روایتوں کا خواہ وہ صحیح وثابت ہوں یا نہ ہوں اپنی کتاب میں جمع کر دینا چاہتے ہیں۔ اور اس بات کی تنقیح کہ اُن میں سے کون سی صحیح وثابت ہے پڑھنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ پس معترضین کی بڑی غلطی ہے۔ کہ اس قسم کی روایتوں کو اپنے اعتراضوں کی بنیاد قرار دیتے ہیں +

مخالفین مذہب کا اعتراض دراصل آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کثرت ازدواج پر ہے اس اعتراض کا یہودیوں یا عیسائیوں اور بت پرست قوموں کی طرف سے ہونا تعجب انگیز ہے۔ کیونکہ توریت یا صحف انبیا یا انجیل میں تعدّدِ ازواج کا امتناع نہیں پایا جاتا۔ اور بت پرست قوموں میں تعدّد ازدواج کا رواج ہے۔ پھر کیا سبب ہے کہ وہ لوگ تعدّد ازواج پر معترض ہوں۔ مگر یہ ایک جواب الزامی ہے۔ جو ہماری نگاہ میں چنداں وقعت نہیں رکھتا۔ اس لئے ضرور ہے۔ کہ ہم حقیقت امر کے بیان کرنے پر متوجہ ہوں +

کثرت یا تعدّد ازواج پر یا طلاق کے جائز ہونے پر جو لوگ عقلی یا اخلاقی یا تمدنی لحاظ سے اعتراض کرتے ہیں اُن سے بہت زیادہ اعتراض اس پر ہوتے ہیں۔ جب ایک زوجہ کے سوا دوسری زوجہ کرنے کا امتناع ہو اور بجز زنا کے اور کسی حالت میں طلاق دینا جائز نہ ہو۔ پس اس پر مخالف یا موافق کا قلم فرسائی کرنا محض بے سود ہے۔ بلکہ عقلاً اور انصافاً عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک پہلو پر اور جو نقصان عقلی اور تمدنی اُن دونو صورتوں میں واقع ہوتے ہیں۔ اُن پر غور کر کے ایک درجہ توسّط اختیار کیا جائے تاکہ جہاں تک ممکن ہو اُن دونو صورتوں میں جو عقلی اور اخلاقی اور تمدنی نقصان ہیں اُن میں کمی واقع ہو۔ ہمارے نزدیک مذہب اسلام میں ایک متوسط درجہ اختیار کیا ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اُس سے اُن تمام نقصانوں میں اور بالخصوص اخلاقی نقصانوں میں بہت کچھ کمی ہو گئی ہے +

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ انبیا علیہم السلام بھی بشر تھے۔ خود قرآن مجید میں ہے کہ خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔ کہ تو یہ کہ "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" مگر انبیا میں ایسے اوصاف ہوتے ہیں۔ جو اعلےٰ ترین بشر میں ہونے چاہئیں۔ اور وہ اوصاف تین قسم پر منقسم ہو سکتے ہیں:۔

اول۔ ذات خاص انبیاء علیہم السلام میں مثل صداقت۔ نیکی۔ تمکین۔ وقار۔

خلق وغیرہ جس سے انسان اپنی قوم یا سوسائٹی میں معزز مکرم محترم گنا جاتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت فرمایا ہے کہ "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ" +

دوم۔ انبیاء ایسے افعال میں مبتلا نہ ہوں جو اُن کی قوم یا سوسائٹی میں معیوب اور باعث ذلت وحقارت ہوں۔ کیونکہ ایسے افعال سے وہ خود اس لائق نہیں رہتے کہ قوم اُن کی عزت کرے۔ اور اُن کو ناصح شفیق سمجھے +

سوم۔ جن امور کو انبیاء معصیت اور گناہ بتاتے ہیں اور لوگوں کو اُن سے ڈراتے ہیں خود اُن امور میں مبتلا نہ ہوئے ہوں۔ جو قول ہو وہی فعل ہو ظاہر و باطن دونو یکساں ہوں۔ ورنہ وہ اس قابل نہیں رہتے کہ لوگوں کو اس کی نصیحت کریں۔ جن میں وہ خود مبتلا ہیں۔ پس انبیاء کے معصوم ہونے کے یہی معنی ہیں کہ وہ ان تینوں نقصانوں سے بری ہوتے ہیں +

کثرت ازواج ایسا امر نہیں ہے کہ جس خاص امر کے لئے انبیاء مبعوث ہوتے ہیں اُس کے مخالف یا اُس میں خلل انداز ہو البتہ اس کو کسی حد تک محدود کرنا تمدنی لحاظ سے مفید ہے۔ جیسا کہ مذہب اسلام نے کیا +

عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں اور یہودیوں میں کثرت ازواج کوئی امر معیوب نہ تھا اور جب تک کہ حکم تحدید ازواج صادر نہیں ہؤا۔ اُس وقت تک کثرت ازواج کے لئے کوئی امر مانع نہ تھا۔ اور جس معاہدہ سے ایک عورت سے معاملہ زناشوئی جائز رکھا جاتا تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ متعدد عورتوں سے بھی اُسی قسم کے معاہدہ سے معاملہ زناشوئی جائز نہ ہو۔ البتہ عورتیں جو اس معاہدہ کے لئے محل تھیں اس قسم کا معاہدہ دوسرے سے نہیں کرسکتی تھیں۔ پس کثرت ازدواج جب تک کہ تحدید ازواج کا حکم نہ ہوا ایسا کوئی فعل نہیں ہے کہ جس کے سبب سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم یا انبیاء سابقین پر نکتہ چینی کی جاوے۔ دلائل عقلی اور نیز قرآن مجید کے تمام احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر احکام ہوتے ہیں کسی امر کے امتناع یا کسی امر کے جواز کے، وہ آئندہ زمانہ سے یعنی اُس حکم کے صادر ہونے کے زمانہ مابعد سے علاقہ رکھتے ہیں۔ نہ اُس حکم کے قبل کے زمانہ سے۔ پس جس جس پاس متعدد ازواج تھیں۔ اُس پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہوسکتی +

حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا کسی عورت کو اپنی زوجیت میں نہ لانا اُن کے تقدس کو جو بہ سبب نبی اور صاحب کتاب ہونے کے تھا کچھ زیادہ نہیں کردیتا۔ کیونکہ اُس کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو تمام یہودی نعوذ باللہ اولاد جائز نہیں سمجھتے تھے۔ پس

اُن کے ساتھ کسی یہودن کا عقد ہونا ممکن نہ تھا۔ اور یہودی دوسری قوم کی عورت سے عقد نہیں کرتے تھے۔ معہذا حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی ابتدائی عمر کا زمانہ مہاجرت میں گذرا اور اخیر زمانہ کچھ بہت طویل نہ تھا۔ کیونکہ صرف تینتیس ۳۳ برس کی عمر میں آپ نے وفات پائی اور اُس وقت تک صرف ستّر آدمی آپ پر ایمان لائے تھے +

عرب جاہلیت میں باپ کی دوسری جورو کو اور دو حقیقی بہنوں کو ایک ساتھ زوجیت میں لانے کا عام دستور تھا۔ علاوہ ان کے بجز بیٹے کی جورو یا متبنّٰی کی جورو اور چند قریب رشتہ داروں کے کچھ تمیز اس بات کی نہ تھی کہ کونسی رشتہ دار عورتیں ایسی ہیں جو زوجیت میں نہیں آسکتیں +

عرب جاہلیت میں زوجیت

مگر خدا نے مسلمانوں کو بتایا کہ جن عورتوں کو تمہارے باپ نے زوجیت میں داخل کیا ہو اُن کو تم اپنی زوجیت میں نہ لاؤ۔ اُس کے بعد بتلایا کہ تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہارے بھائی کی بیٹیاں یعنی بھتیجیاں اور تمہاری بہن کی بیٹیاں یعنی بھانجیاں اور تمہاری دودھ پلائیاں کہ تمہاری ماؤں کی مانند ہیں اور تمہاری دودھ شریک جو مثل بہنوں کے ہیں۔ اور تمہاری بیویوں کی مائیں یعنی ساسیں اور وہ لڑکیاں جو تمہاری جورویں اپنے ساتھ لاویں جن سے تم نے مقاربت کی ہو اور تمہاری صلبی بیٹوں کی جورویں اور دو بہنوں کو ایک ساتھ زوجیت میں داخل کرنا تم پر حرام ہے +

محرمات

ان دونو مقاموں میں جن میں عورتوں کو زوجیت میں لانے سے منع کیا گیا ہے۔ الفاظ الّا ما قد سلف کے آئے ہیں جس کے معنی صاف یہ ہیں کہ اس حکم سے پہلے جو ہوا سو ہوا۔ چنانچہ آیت مذکور یہ ہے:۔

ولا تنکحوا ما نکح اٰباؤکم من النساء الا ما قد سلف انہ کان فاحشۃً ومقتاً وساء سبیلا۔ حرمت علیکم امھاتکم وبنٰتکم واخواتکم وعمّٰتکم وخٰلٰتکم وبنٰت الاخ وبنٰت الاخت وامّھاتکم الّتی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعۃ وامّھٰت نسائکم وربائبکم الّتی فی حجورکم من نسائکم الّتی دخلتم بھنّ فان لم تکونوا دخلتم بھنّ فلا جناح علیکم وحلائل ابنائکم الّذین من اصلابکم وان تجمعوا بین الاختین الّا ما قد سلف ان اللہ کان غفورا رحیما + سورۂ نساء آیت ۲۶ و ۲۷ +

الفاظ الّا ما قد سلف سے یہ مراد ہے کہ جن لوگوں نے قبل نزول اس آیت کے ان محرمات میں سے جن کا ذکر اس آیت میں ہے کسی کو زوجیت میں داخل کر لیا تھا اور وہ امر گذر بھی گیا اور اب موجود نہیں ہے تو اس پر کچھ مواخذہ نہیں ہے۔ لیکن اس آیت کے اُترنے کے

بعد اگر ان محرمات میں سے کوئی عورت کسی کی زوجیت میں موجود ہے تو اُس کی تفریق لازم ہے کیونکہ وہ الا ما قد سلف میں داخل نہیں ہے۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج میں کوئی ایسی عورت نہیں تھی۔ جو ان محرمات میں سے ہو +

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو اس بات پر رہنے نہیں دیا کہ اُس کے باپ کی جورو اُس کی زوجیت میں رہے۔ اگرچہ زمانہ جاہلیت میں اُس نے اپنے باپ کی جورو کو اپنی زوجیت میں لیا ہو۔ اور براؔ سے ایک روایت لکھی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوہودہ کو ایک شخص کے پاس روانہ کیا جس نے اپنے باپ کی جورو کو اپنی جورو بنا لیا تھا تاکہ اس کو قتل کر ڈالے اور اُس کا مال چھین لے +

رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت میں جو عورتیں آسکتی تھیں خدا نے قرآن مجید میں ان کو اس طرح بتایا ہے +

۱۔ وہ بیویاں جن کا مہر دیا جاوے یعنی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقد میں آویں +

۲۔ جو بطور فےَ کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آویں +

۳۔ چچا کی بیٹیاں۔ پھوپھی کی بیٹیاں۔ ماموں کی بیٹیاں۔ خالہ کی بیٹیاں (جنھوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی) +

۴۔ کوئی مسلمان عورت اگر اپنا نفس پیغمبر کو ہبہ کر دے یعنی بے مہر نکاح میں آنا چاہے اور پیغمبر اس سے نکاح کرنا چاہیں۔ مگر یہ حکم سوائے مسلمانوں کے خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے ہے اور وہ آیت یہ ہے:۔

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وبنات عماتك وَبَنٰتِ خَالِكَ وبناتِ خالاتِكَ الّٰتِیْ هاجرن معك وامرأةً مؤمنةً ان وهبت نفسها لِلنَّبِیِّ اِنْ اراد النَّبِیُّ ان یستنكحها خالصةً لك من دون المؤمنین + سورۃ احزاب آیہ ۴۹ +

ان دونو آیتوں میں جو حکم مسلمانوں کے لئے ہے۔ اور جو حکم آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہے۔ اس میں بجز اس حکم کے جو نمبر ۴ میں بیان ہوا ہے اور کسی میں کچھ فرق نہیں ہے۔ بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت رشتہ داروں سے نکاح کرنے میں یہ قید زیادہ لگی ہوئی ہے۔ کہ جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے ساتھ ہجرت کی ہو۔ حالانکہ مسلمانوں کو رشتہ دار عورتوں سے نکاح کرنے میں یہ قید نہیں ہے +

باقی رہا یہ امر کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے جس نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کردیا ہو۔ یعنی بے مہر نکاح کیا ہو۔ اور ایسی اجازت اور کسی مسلمان کو نہیں دیگئی۔ مگر یہ امر کچھ ایسا مہتم بالشان نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی امر بدگمانی کا جیساکہ مخالفین مذہب اسلام خیال کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ خود عورت کا درخواست کرنا کہ میں بغیر کسی مہر کے نکاح میں آنا چاہتی ہوں اُن تمام بدگمانیوں کو رفع کرتا ہے۔ جو مخالفین مذہب اسلام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت کرتے ہیں +

مگر عام مسلمانوں کی بھی ایسی اجازت دینا آیندہ کے بہت سے تنازعات کا باعث تھا۔ جب کوئی عورت اپنے مہر کا دعوے کرتی تو شوہر کو اس عذر کا بہت موقع ملتا۔ کہ اُس نے اپنا نفس مجھ پر ہبہ کردیا ہے یعنی بلا مہر میرے ساتھ نکاح کیا ہے۔ اس لئے نہایت ضرور تھا کہ اس بات کی تصریح کردی جاوے کہ یہ حکم خاص آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہے مسلمانوں کے لئے نہیں ہے +

مخالفین مذہب اسلام کہتے ہیں کہ سورۂ نساء کے ابتدا میں جو آیت ہے اُس سے تمام مسلمانوں کو چار جوروؤں سے زیادہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کے پاس چار جوروؤں سے زیادہ تھیں تو اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ چار سے جو زیادہ ہیں اُن کو علیحدہ کردو۔ چنانچہ ابوداؤد[1] اور ابن ماجہ میں ہے کہ قیس بن الحرث جب مسلمان ہوا۔ تو اُس کے پاس آٹھ جوروئیں تھیں۔ جب اُس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا۔ تو آپ نے اُس کو حکم دیا کہ اُن میں سے چار کو رکھو۔ اور ابن ماجہ[2] اور ترمذی[3] میں ہے کہ جب غیلان الثقفی مسلمان ہوا تو اُس کے پاس دس عورتیں تھیں اور وہ سب کی سب اُس کے ساتھ مسلمان ہوگئی تھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کو حکم دیا کہ اُن میں سے چار کو چُن لو۔ یعنی باقی کو چھوڑ دو۔ مگر خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے چار سے زیادہ اپنی ازواج مطہرات رکھیں۔ یہاں تک کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو نو بیویاں زندہ موجود تھیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا تعالے نے اُن عورتوں سے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت میں آچکی ہوں دوسروں کو نکاح کرنے سے منع کیا تھا اور وہ آیت یہ ہے ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابداً۔ یعنی اے مسلمانو!

[1] ابوداؤد جلد اول صفحہ ۳۰۳ + [2] ابن ماجہ صفحہ ۱۴۴ + [3] ترمذی صفحہ ۱۹۰ +

پیغمبر خدا کی جورؤں سے اُس کے بعد کبھی نکاح مت کرو۔ بعد کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے اُس کی نسبت مفسروں نے لکھا ہے کہ من بعدہ سے مراد وفات رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ حالانکہ آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے کہ بعد سے بعد وفات مراد ہو۔ اور اگر بعد سے بعد وفات مراد لی جاوے تو یہ معنی ہونگے کہ زمانۂ حیات آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اُن کی ازواج سے جن کو آپ نے چھوڑ دیا ہو نکاح جائز ہوگا۔ پس کیسی مہمل بات ہے کہ جو فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد نا جائز ہو وہ آپ کی حیات میں جائز قرار دیا جاوے۔ پس من بعدہ[1] کے معنی ہیں بعد ازواجہ یعنی بعد اس کے کہ وہ عورت زوجیت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آچکی ہو۔ اس سے کسی مسلمان کو نکاح جائز نہیں۔ پس سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی زوجہ کو اپنی زوجیت سے خارج نہیں کر سکتے تھے (اور یہ بات آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی زوجہ کو طلاق دی تھی کسی طرح ثابت نہیں جس کو ہم بیان کرینگے) مگر مسلمانوں کی عورتوں سے یہ حکم متعلق نہ تھا۔ اس لئے خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تمام ازواج کو قائم رکھا۔ اور جن مسلمانوں کے پاس چار عورتوں سے زیادہ نکاح میں تھیں اُن کی نسبت فرمایا کہ چار کو رہنے دو اور اُن سے جو زیادہ ہوں اُن کو چھوڑ دو۔

کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ کیوں ایسا حکم نازل ہوا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت میں جو عورت آگئی ہو اُس سے پھر کوئی شخص نکاح نہیں کر سکتا۔ مگر یہ حکم نہایت عمدہ ہے۔ اگر اس کا امتناع نہ ہوتا تو اسلام میں نہایت فتور واقع ہوتا۔ یہ عورتیں اپنے نئے خاوند کے سبب اور اُن کے مطلب کے موافق سینکڑوں حدیثیں اور روایتیں رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی بیان کرتیں جن میں ایک فتنہ عظیم اسلام میں برپا ہوتا۔ اور اسلام میں باعث فتور اور اُس کے احکام میں اختلال کا سبب ہوتا۔ اس لئے یہ حکم نہایت ضروری تھا کہ جو عورتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت میں آچکی ہیں۔ وہ دوسروں سے نکاح نہ کرنے پاویں۔

ان تمام اعتراضوں سے مخالفین مذہب اسلام کا یہ مقصد ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے کا الزام لگائیں مگر جو احکام آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت قرآن مجید میں ہیں اُن کے جاننے کے بعد کون شخص اس الزام کو صحیح مان سکتا ہے؟

سورۂ احزاب میں یہ آیت ہے لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ

[1] من بعدہ ای من بعد وفاتہ او فراقہ تفسیر بیضاوی جلد ۲ چھاپہ لکھنؤ صفحہ ...

تبدّل بِھِنّ من ازواجٍ ولو اعجبکَ حسنھنّ یعنی جس قدر ازواج موجود ہیں۔ اس کے بعد تیرے لئے عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ بات تیرے لئے حلال ہے۔ کہ اُن کی جگہ اور جوروؤں کو بدل لے گو کہ تجھ کو اُن کا حُسن اچھا معلوم ہو۔ پس جو شخص کہ خواہش نفسانی کے پورا کرنے کا آرزومند ہو وہ ایسی قیدیں اپنے ساتھ لگا سکتا ہے کہ نہ تو وہ کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لا سکے اور جو جوروئیں موجود ہیں نہ اُن کے بدلے میں اور جورو لا سکے۔ پس کیسا غلط خیال ہے جو معترضین آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت خیال کرتے ہیں +

بعض مفسّرین نے ولا ان تبدّل کے لفظ سے جو اس آیت میں ہے۔ یہ سمجھا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ازواج کو طلاق دینا جائز نہیں رہا تھا۔ کیونکہ تبدل ازواج اسی طرح پر ہو سکتا ہے کہ ایک کو زوجیت سے خارج کیا جائے۔ اور دوسری کو اس کی جگہ لیا جائے اور یہ امر بغیر اس کے کہ ایک کو طلاق دی جائے نہیں ہو سکتا۔ پس گویا اس آیت سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ازواج میں سے کسی زوجہ کو طلاق دینا جائز نہیں رہا تھا جو نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے کے بالکل برخلاف ہے +

اگر یہ قول مفسّرین کا صحیح ہو تو اس بات کا سبب کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوصف محدود ہو جانے تعداد ازواج کے کیوں چار سے زیادہ ازواج اپنے پاس رہنے دیں بہت عمدگی سے واضح ہو جاتا ہے +

معترض کہ سکتا ہے کہ تم نے جو یہ بات قرار دی ہے کہ ان لا تبدل سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طلاق دینا منع ہو گیا تھا یہ غلط ہے اس لئے کہ سورۂ طلاق میں صاف لکھا ہے کہ یَاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ الخ اور اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طلاق دینے کی صاف اجازت پائی جاتی ہے۔ مگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ تمام قرآن مجید میں جہاں پیغمبر کو یَاَیُّھَا النَّبِیُّ کر کے خطاب کیا ہے اُس کے بعد صیغہ واحد حاضر کا آیا ہے جیسے کہ یَاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ۔ اور یَاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ۔ مگر صرف سورۂ طلاق کی آیت میں یہ سیاق بدل دیا ہے۔ اور اس میں یَاَیُّھَا النَّبِیُّ کے بعد کہا ہے اذا طلقتم جمع کے صیغے سے۔ پس اس تبدیل سیاق پر غور کرنا ضرور ہے۔ اس تبدیل سیاق کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب نہیں ہیں۔ بلکہ مسلمان مخاطب ہیں اور تقدیر آیت کی یہ ہے کہ یاایھا النبی قل للمومنین اذا طلقتم النساء الخ اور چونکہ مسلمان مخاطب تھے۔ اس لئے صیغہ جمع کا آیا ہے +

بخاری میں عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی جورو کو اُس ناپاکی کے زمانہ میں جو ہر مہینہ عورتوں کو ہوتی ہے طلاق دیدی تھی۔ اُس کی نسبت حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا۔ اُس میں یہ آیت سورہ طلاق کی نازل ہوئی۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ عمر بن سعید اور عتبہ بن غزوان نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ پس اس آیت سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ازواج کو طلاق دینے کا اختیار ثابت نہیں ہوتا +

جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہ کو جو حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں مذکورہ بالا حالت میں طلاق دیدی تھی اُس پر یہ آیت نازل ہوئی ہے یہ کہنا اُن کا اس لئے غلط ہے کہ اگر حفصہ کی طلاق کے سبب یہ آیت خاص رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت نازل ہوتی تو طلقتم صیغہ جمع کا نہیں آسکتا تھا +

ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس روایت میں حضرت حفصہؓ کا طلاق دینا بیان ہوا ہے۔ اُس میں راوی کو غلطی ہوئی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے اس کا حکم آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تھا۔ پس راوی یہ سمجھا کہ حضرت عمرؓ کی بیٹی کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طلاق دیدی ہے۔ حالانکہ عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی جورو کو طلاق دیدی تھی۔ نہ پیغمبر خدا نے حفصہؓ کو جو حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں +

اور سورہ تحریم میں یہ آیت ہے عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا +

یعنی اگر پیغمبر تم کو طلاق دیدے تو قریب ہے خدا اُس کے بدلے میں ایسی بیویاں دے جو تم سے بہتر ہوں اور جو مسلمان ہوں اور جو ایمان والیاں دعا کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں۔ عبادت کرنے والیاں۔ روزہ رکھنے والیاں اور بیاہی اور بن بیاہی ہوں +

اس آیت کو یہ قرار دینا کہ اس آیت سے پایا جاتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو طلاق دینے کی اجازت تھی محض غلط ہے۔ کیونکہ یہ آیت حکم پر کسی طرح دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ اس میں شرط اور تعلیق ہے اور اس سے مقصود خوف دلانا اور قدرت کا ظاہر کرنا ہے نہ یہ جتانا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ازواج کو طلاق دیسکتے ہیں یا اُن کو طلاق دینی چاہئے۔ چنانچہ تفسیر کبیر اور لباب التاویل میں صاف لکھا ہے کہ ھذا من باب الاخبار عن القدرة لا عن الکون لانہ قال ان طلقکن وقد علم انہ لا یطلقھن فاخبر عن قدرة انہ ان طلقھن ابدلہ ازواجا خیرا منھن

تخویفاً لھن۔ یعنی اس آیت میں خدا نے اپنی قدرت کی خبر دی ہے نہ کسی امر کے واقع ہونے کی۔ کیونکہ اُس نے فرمایا کہ اگر وہ تم کو طلاق دیدے اور یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ پیغمبر اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دیئے کے اس سے معلوم ہؤا کہ خدا نے محض اپنی قدرت جتائی ہے کہ اگر پیغمبر اپنی بیویوں کو طلاق دیدیں تو خدا اُن بیویوں سے بہتر عورتیں اُن کے بدلہ میں دیگا۔ اور یہ اصل میں اُن کو خوف دلانے اور ڈرانے کے طور پر کہا ہے۔ پس یہ آیت کسی طرح اس لائق نہیں ہے کہ اُس سے اس امر پر استدلال کیا جاوے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طلاق دینے کی اجازت تھی +

جب یہ آیت نازل ہوئی اور اُس کا چرچا لوگوں میں پھیلا تو لوگوں نے یہ غلط خیال کیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی کل ازواج کو طلاق دیدی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کسی کو بھی طلاق نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے آپ سے اجازت لیکر مسجد کے دروازہ پر بلند آواز سے کہا کہ یہ خبر غلط ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بیوی کو طلاق نہیں دی +

سورۂ احزاب میں یہ آیت ہے یاایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحاً جمیلا وان کنتن تردن اللہ ورسولہ والدار الاخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجراً عظیما۔ یعنی اے پیغمبر تم اپنی بیویوں سے کہدو کہ اگر تم دنیا کی زندگی کو پسند کرتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ دے دلا کر اچھی طرح رخصت کردوں اور اگر تم اللہ اور اُس کے رسول کو اور آخرت کو پسند کرتی ہو تو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ خدا نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لئے بڑا ثواب ٹھیرایا ہے +

یہ آیت۔ آیت تخییر کہلاتی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کو اختیار دیا گیا تھا کہ چاہیں وہ دنیا کو اختیار کریں چاہیں دین کو مگر یہ آیت اُس آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طلاق دینے کا امتناع ہؤا ہے اور جس کو ہم پہلے لکھ آئے ہیں اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے +

اس آیت میں بھی مہر کا ذکر ہے اور سورۂ احزاب کی آیت قد علمنا ما فرضنا علیھم فی ازواجھم میں بھی لفظ ما سے مہر مراد ہے۔ جس سے ثابت ہے کہ آیات سورۂ احزاب سے پہلے ازواج کے لئے مہر مقرر ہو چکا تھا اور جس آیت میں مہر مقرر ہونے کا ذکر ہے وہ سورہ نساء کی آیت ہے۔ پس صاف پایا جاتا ہے کہ سورۂ نساء کی آیت

قبل آیات سورۂ احزاب نازل ہو چکی تھی۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد نزول آیت سورۂ نسار بھی عورتوں سے نکاح کیا۔ حضرت زینبؓ بن جحش سے جن کا ذکر خود سورۂ احزاب میں ہے ۵ھ ہجری میں نکاح ہوا۔ اور اس کے بعد بھی ۷ھ ہجری تک نکاح ہوتا رہا۔ پس کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد نزول آیت سورۂ نسار کے جس میں چار ازواج کرنے کا حکم ہے اور عورتوں سے نکاح کیا۔ مگر اس دلیل میں یہ غلطی ہے۔ کہ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج کے مہر کا تقرر اُسی وقت ہوا تھا۔ جب کہ تحدید ازواج کا حکم سورۂ نسار میں نازل ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے عرب جاہلیت میں بہت سی باتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی باقی تھیں اور عرب جاہلیت میں بھی زوجہ کے لئے مہر مقرر کرنا یا اس کو دیدینے کا عام رواج تھا خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہ کے ساتھ ۲۰ برس قبل ہجرت کے ہوا تھا۔ یعنی اُس وقت تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث بھی نہیں ہوئے تھے۔ اُس وقت بھی مہر مقرر ہوا اور سونے کے ساڑھے سات اوقیہ کے برابر مہر دیا گیا نبوت کے بہت زمانہ بعد تحدید ازواج کا حکم نازل ہوا ہے۔ پس سورۂ نسار اور سورۂ احزاب کی آیتوں میں مہر کے ذکر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جب تحدید ازواج کا حکم نازل ہوا ہے اُسی کے ساتھ مہر کے مقرر کرنے کا بھی حکم ہوا تھا +

بلکہ نہایت قرین قیاس ہے کہ آیت سورۂ نسار در باب تحدید ازواج مسلمانان اور نسبت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اور آیت سورۂ احزاب لا یحل لک النساء قریب قریب زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔ ایک میں مسلمانوں کے لئے ازواج کی تحدید ہے اور دوسری میں پیغمبر کی نسبت آیندہ کسی عورت سے نکاح کرنے کا امتناع ہے +

ہم نے کہا ہے کہ قرین قیاس ہے کہ وہ دونو آیتیں قریب قریب نازل ہوئی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زمانۂ نزول آیت کا تحقیق ہونا نہایت مشکل امر ہے قرینہ اور قیاس سے اس کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ مفسرین اور اہل سیر نے جو زمانے نزول آیت کے قرار دیئے ہیں یا شان نزول آیات بیان کی ہیں۔ اُن میں سے اکثر مطلق قابل اعتبار کے نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اُس کی اسناد کافی نہیں ہیں +

سورہ احزاب میں ایک خاص حکم آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تھا کہ اگر کوئی عورت بلا مہر نکاح کرنے کی درخواست کرے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اُس سے نکاح کرنا چاہیں تو بلا مہر نکاح کر سکتے ہیں۔ اس اجازت کی نسبت خدا نے

کہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے مقرر کیا ہے مسلمانوں پر اُن کی ازواج ہیں یعنی مہر کا دینا۔ لیکن ہم نے جو یہ کہدیا کہ بلا مہر نکاح کرنے کا حکم خاص تمہارے لئے ہے۔ اس لئے کہدیا کہ تم کو اس میں کچھ تردد یعنی دل میں کچھ دھکڑ پھکڑ نہ رہے۔ تفسیر ابن عباس میں لفظ جرح کی تفسیر میں ما ثم لکھا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر لفظ جرح سے اس مقام پر سہولیت اور آسانی مراد لینا ٹھیک نہیں ہے +

لفظ فرض اور فریضہ کے معنی ہیں مقرر کرنے کے۔ فقہا نے جو الفاظ فرض۔ واجب۔ سنت۔ مستحب واسطے تفریق و تقسیم احکام شرعی کے بطور اصطلاح اختیار کئے ہیں اُن معنوں میں فرض کا لفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا ہے۔ پس جن لوگوں نے فرضنا و فریضہ کے معنی سے وہ لفظ سمجھے ہیں جو فقہا نے اپنی اصطلاح میں قرار دیئے ہیں تو اُن سمجھنے والوں نے اُن کے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اور ہر گاہ مہر کا تقرر ابراہیمی شریعت کا باقیماندہ حکم تھا۔ جیسے حج اور غسل جنابت وغیرہ تو خدا کا یہ کہنا کہ قد علمنا ما فرضنا علیھم فی ازواجھم بالکل ٹھیک اور صحیح تھا +

سورۂ احزاب میں ایک اور آیت ہے جس میں خدا نے اپنے رسول کو کہا ہے کہ اپنی ازواج میں سے جس کو چاہے علیحدہ رکھے اور جس کو چاہے اپنے پاس رکھے اور جس کو علیحدہ رکھا ہے اگر اس کو اپنے پاس بلانا چاہے تو کچھ گناہ نہیں ہے اور وہ آیت یہ ہے تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي الیک من تشاء ومن ابتغیت ممن عزلت فلا جناح علیک +

اس آیت سے اکثر مفسرین نے سمجھا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے پہلے سے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر باری باری سے اپنے ازواج پاس رہنا واجب تھا۔ اور اس آیت سے باری باری سے اپنی ازواج پاس رہنا واجب نہیں رہا۔ اس میں شک نہیں کہ جب متعدد ازواج ہوں تو بلاشبہ شوہر کو لازم ہے کہ باری باری سے اُن کے پاس رہے۔ مگر ہم کو قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نہیں ملی جس سے بالتصریح باری باری سے رہنا واجب قرار دیا ہو۔ سورۂ نسار کی آیت میں جو یہ الفاظ ہیں۔ کہ فان خفتم ان لا تعدلوا لفظ لا تعدلوا سے ازواج میں عدل کرنا واجب ٹھہرایا ہے۔ اور باری باری سے ازواج کے پاس رہنا بھی عدل میں داخل کیا ہے مگر یہ صرف ایک ایسا حکم ہے کہ آیت کے الفاظ سے استنباط کیا ہے۔ مگر نص نہیں ہے +

تعدد ازواج میں ازواج کی حالت بلحاظ طبیعت انسانی یکساں نہیں رہتی۔ انسان

کو بیماریاں غیر متوقع لاحق ہوتی ہیں جن سے عورتیں بھی مستثنےٰ نہیں ہیں۔ علاوہ اس کے خود عورتوں کی طبعی حالت یکساں نہیں رہتی پس ایسی حالت میں باری کا التزام نہیں ہو سکتا۔ اسی واسطے خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اجازت دی ہے۔ کہ ازواج میں سے جس کو چاہو علیحدہ رکھو اور جس کو چاہو اپنے ساتھ۔ اور جس کو علیحدہ رکھا ہے اُس کو پھر اپنے پاس بلا لو۔ پس یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اُس کے سبب سے کوئی نکتہ چینی کی جاوے۔ کیونکہ یہ حکم طبیعت انسانی کے موافق ہے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور تمام انسانوں سے یکساں متعلق ہو سکتا ہے +

اب ہم ازواج مطہرات کا مختصر تاریخی حال بیان کرتے ہیں۔ اور جو نکتہ چینی ہر ایک کی نسبت کی گئی ہے۔ اس کی تحقیق کرتے ہیں +

خدیجہؓ

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت خدیجہؓ کے باپ کا نام خویلد ہے اور وہ قوم قریش میں سے تھیں۔ اُن کی ماں کا نام فاطمہ بنت زائدہ ہے۔ نوفل اُن کا چچا تھا۔ اور نوفل کا بیٹا ورقہ اُن کا چچا زاد بھائی تھا۔ اور حضرت خدیجہؓ ۶۸ سنہ قبل ہجری میں پیدا ہوئیں +

پہلے حضرت خدیجہؓ کا نکاح ابو ہالہ بن زرارہ سے ہوا تھا اور اُس سے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک کا نام ہند اور دوسرے کا نام ہالہ تھا جب ابو ہالہ مرگیا تو حضرت خدیجہؓ نے عتیق بن عائذ سے نکاح کیا۔ جو قریش کے قبیلہ بنی مخزوم سے تھا۔ اور اُس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ہند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کا باپ بہت امیر تھا۔ اور اُن کے ہاں تجارت ہوتی تھی۔ ایک دفعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لیکر بصرے میں گئے۔ اور اُس مال کو بہت نفع سے فروخت کیا اور واپس آکر اُس سے بہت زیادہ نفع اُن کو دیا جو اور لوگ دیتے تھے +

جبکہ عتیق بن عائذ دوسرا شوہر بھی مرگیا۔ تو حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ۲۸ سنہ قبل ہجری میں نکاح کیا۔ یہ بات سچ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کچھ دولتمند نہیں تھے مگر ایک نہایت اعلےٰ خاندان قریش سے تھے اور ان کی امانت و دیانت اور سچائی عام طور سے لوگوں میں مشہور تھی۔ اور اُن کا لقب **امین عرب** ہو گیا تھا۔ اس سبب سے حضرت خدیجہؓ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح کرنے کا خیال ہوا۔ نکاح کے وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۲۵ سال کی اور حضرت خدیجہؓ کی ۴۰ سال کی تھی +

بعد نکاح کے اُن سے چار لڑکیاں زینبؓ۔ رقیہؓ۔ ام کلثومؓ اور فاطمہ زہراؓ پیدا ہوئیں۔ اور لڑکوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ مگر اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ کل لڑکوں نے صغر سنی میں وفات پائی اور حضرت خدیجہؓ نے ۳ سنہ قبل ہجری میں جب کہ پینسٹھ سال کی عمر تھی مکہ میں انتقال کیا +

اس بات میں سب کو اتفاق ہے کہ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسری عورت سے حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں نکاح نہ کرنے کا کوئی سبب ہو مگر یہ بات کہ اس وقت تک موافق رسم عیسائی مذہب کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرا نکاح نہ کر سکتے تھے **محض غلط** ہے اس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ ورقہ بن نوفل شام میں جا کر بذات خود عیسائی ہو گیا تھا۔ مگر یہ بات کہ خویلد حضرت خدیجہؓ کا باپ اور حضرت خدیجہؓ اور اُن کے خاندان کے اور لوگ بھی عیسائی ہو گئے تھے کسی روایت سے **ثابت** نہیں ہے معہذا انجیلوں سے جو اس وقت موجود ہیں۔ تعدد ازواج کا **امتناع** کسی طرح پایا نہیں جاتا۔ پس یہ کہنا کہ مذہب **عیسوی** کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسری شادی نہیں کر سکتے تھے محض غلط ہے +

حضرت سودہؓ رضی اللہ عنہا۔ حضرت سودہ کے باپ کا نام زمعہ اور ماں کا نام شموس[۵] بنت قیس تھا۔ اُن کا پہلا نکاح سکران بن عمرو سے ہوا تھا۔ اور اُس سے ایک لڑکا عبدالرحمن پیدا ہوا۔ حضرت سودہؓ اور اُن کا شوہر سکران بن عمرو دونوں مسلمان ہو گئے تھے اور جب کہ دوسری دفعہ مسلمان ہجرت کے حبش کو چلے گئے تھے حضرت سودہؓ بھی مع اپنے شوہر کے مکہ سے حبش کو ہجرت کر گئی تھیں۔ جب وہ حبش سے واپس آئیں۔ تو مکہ میں اُن کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ پھر ۳ سنہ قبل ہجری میں جب کہ حضرت خدیجہؓ انتقال کر چکی تھیں۔ حضرت سودہؓ کا نکاح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر (۵۰) سال کی تھی۔ مگر حضرت سودہؓ کی عمر اُس وقت کیا تھی کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوتی۔ بعد وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُن کی وفات ۲۳ سنہ ہجری میں ہوئی +

یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سودہؓ سے کسی خواہش نفسانی کے سبب سے نکاح کیا ہو جیسا کہ معترضین کہتے ہیں۔ بلکہ حضرت سودہؓ قدیم الایمان تھیں۔ اور کفار مکہ سے تکلیفیں اُٹھائی تھیں اور حبشہ کی ہجرت پر مجبور ہوئی تھیں۔

سودہؓ

[۵] ان کا سلسلہ عامر بن لوی تک پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے عامریہ کہلاتی تھیں + (احمد بابا مخدومی)

آخر الامر جب واپس آئیں تو اُن کے شوہر نے انتقال کیا۔ پس آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُن کو زوجیت میں لانا مقتضائے انسانیت اور تفقد اُن کے حال پر تھا۔ نہ مقتضائے خواہش نفسانی +

سودہؓ بہت بڑھیا اور از کار رفتہ ہو گئی تھیں اُن کو خوف ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کو طلاق نہ دیدیں۔ اس لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ مجھ کو اپنی زوجیت میں رہنے دیں جو حقوق میری زوجیت کے ہیں وہ میں حضرت عایشہؓ کو دیدیتی ہوں +

سورۂ نسا میں جو یہ آیت ہے وَاِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِہَا نُشُوْزًا اَوْ اعراضًا فلا جناح علیہما ان یُّصْلِحَا بَیْنَہُمَا صُلْحًا والصلح خیر یعنی اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے علیحدگی اور بے پروائی کا اندیشہ ہو تو اُن دونو پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ وہ آپس میں صلح کرلیں اور صلح بہتر ہے +

اس آیت کو بعض راوی کہتے ہیں کہ حضرت سودہؓ کی شان میں اُتری ہے۔ جب کہ ان کو خوف ہوا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کو طلاق دیدینگے اور بعض راوی کہتے ہیں کہ یہ آیت کسی خاص واقع پر نازل نہیں ہوئی۔ بلکہ بطور عام احکام کے نازل ہوئی ہے۔ لیکن حضرت سودہؓ نے بموجب اسی آیت کے کہ دیا تھا کہ میں اپنا حق زوجیت حضرت عایشہؓ کو دیدیتی ہوں۔ بہرحال یہ آیت خواہ حضرت سودہؓ کی شان میں اُتری ہو یا بطور حکم عام کے۔ ہماری رائے میں کچھ زیادہ بحث کے لائق نہیں ہے +

حفصہؓ

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت حفصہؓ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں۔ اُن کی ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ جنہوں نے بعد اسلام قبول کرنے کے ہجرت کی تھی۔ حضرت حفصہؓ کے پہلے شوہر کا نام خُنَیس ابن حذافہ تھا جنہوں نے حضرت حفصہؓ کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ اور جن کا انتقال بعد غزوۂ بدر کے ہُوا +

خُنَیس کے انتقال کے بعد اُن کا نکاح ۳ھ ہجری میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہُوا۔ اُس وقت اُن کی عمر ۲۱ سال کی تھی اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۵۶ سال کی تھی۔ اُن کا انتقال ۴۵ھ ہجری میں بعد وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوا۔ اور اُس وقت اُن کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ اس حساب سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کی ولادت ۱۸ھ قبل ہجری میں ہوئی تھی۔ بعض روایتوں میں ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کو طلاق رجعی دیدی تھی۔ مگر ہمارے نزدیک آنحضرت صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کا طلاق دینا ثابت نہیں ہے - اس کا ذکر سوائے ابن ماجہ کے غالباً اورکسی حدیث
کی معتبر کتاب میں نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ابن ماجہ کی جو حدیث ہے اس میں سلمہ بن کہیل
ایک شیعہ مذہب کا راوی ہے۔ جس کی روایت حضرت عمرؓ کی بیٹی کی نسبت اعتماد کے لائق
نہیں ہے - ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جس روایت میں حضرت حفصہؓ کا طلاق دینا بیان ہوا ہے
اُس میں راوی کو غلطی ہوئی ہے - اس لئے کہ عبد اللہ بن عمرؓ نے اپنی جورو کی طلاق دی تھی اور
حضرت عمرؓ نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُس مسئلہ کی نسبت پوچھا تھا - اس
سبب سے راوی کو شبہ ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی بیٹی حضرت
حفصہؓ کو طلاق دیدی ہے - غرضیکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت حفصہؓ کو طلاق
دینا ثابت نہیں ہے - باقی رہی یہ بات کہ حضرت حفصہؓ نے کوئی بھید آنحضرت صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کا کھول دیا تھا - اُس کی نسبت جو کچھ ہم کو کہنا ہے وہ ماریہ[1] قبطیہ کے حال میں بیان
کرینگے +

ام حبیبہؓ

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا - حضرت ام حبیبہؓ کا اصلی نام رملہ تھا
اُن کے باپ کا نام ابو صفیان اور ماں کا نام صفیہ تھا - ماں اور باپ دونو طرف سے وہ خاندان
بنی امیہ سے تھیں - اُن کا پہلا شوہر عبید اللہ بن جحش تھا - جو پہلے مسلمان ہو گیا تھا - اور جب
ملک حبش کو دوسری بار لوگ ہجرت کرنے لگے - تو وہ بھی اپنی بی بی اُم حبیبہؓ کے ساتھ
ملک حبش کو چلا گیا تھا - وہاں جا کر عبید اللہ تو عیسائی ہو گیا - مگر حضرت ام حبیبہؓ مذہب
اسلام پر قائم رہیں - جب عبید اللہ مر گیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجاشی
کو بطور ولی کے قرار دیکر کہلا بھیجا - کہ اُن کا نکاح اُم حبیبہؓ سے کر دے - چنانچہ سنہ
ہجری میں بمقام حبش اُم حبیبہ کا نکاح ہوا - اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف
سے نجاشی نے مہر ادا کیا - اُس وقت اُم حبیبہؓ کی عمر ۳۶ سال کی اور آنحضرت صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۶۰ سال کی تھی - بعد نکاح کے حضرت ام حبیبہؓ ملک حبش سے آئیں
اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس رہیں بعد وفات رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے اُن کی وفات سنہ ۴۴ ہجری میں ہوئی - جبکہ اُن کی عمر ۷۴ سال کی ہو چکی تھی - اُن کی نسبت
کوئی نکتہ چینی قابل التفات نہیں ہے +

اُم سلمہؓ

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا - حضرت اُم سلمہؓ جن کا اصلی
نام ہند تھا - ان کی ماں کا نام عاتکہ ہے جو قبیلہ بنو کنانہ میں سے تھیں - مگر یہ عاتکہ
عبد المطلب کی بیٹی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی نہیں تھیں - بلکہ

[1] ماریہ قبطیہؓ کا حال لکھنے نہیں پائے افسوس! (احمد مخدومی)

اُن کے باپ کا نام عامر تھا۔حضرت ام سلمہؓ کے باپ ابوامیہ تھے۔جن کا نام حذیفہ تھا۔اور عرب کے مشہور فیاض اور شہسوار لوگوں میں خیال کئے جاتے تھے +

صرف حضرت اُم سلمہؓ کے پہلے شوہر ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی تھے۔وہ اور اُن کے شوہر دونو مسلمان ہوکر ملک حبش کو ہجرت کر گئے تھے۔وہاں اُن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔جس کا نام زینب تھا۔اُس کے بعد ایک اور لڑکی پیدا ہوئی۔جس کا نام درّہ تھا اور دو لڑکے سلمہ اور عمر بھی اسی نکاح سے پیدا ہوئے تھے +

ابوسلمہ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے۔جب اُنھوں نے ۴ھ ہجری میں وفات پائی تو حضرت ام سلمہ کا نکاح رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہؤا۔اُس وقت اُن کی عمر ۲۶ سال کی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۵۷ سال کی تھی۔انھوں نے ۶۲ھ ہجری میں بعد وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفات پائی۔اور اُن کی عمر ۸۴ سال کی ہوئی۔اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ولادت ۲۲ھ قبل ہجری میں ہوئی تھی۔حضرت ام سلمہؓ کی نسبت کوئی نکتہ چینی قابل توجہ نہیں ہے +

زینب ام الم

حضرت زینب اُمّ المساکین رضی اللہ عنہا۔حضرت زینبؓ جو بہ سبب اپنی فیاضی کے ایام جاہلیت میں اُمّ المساکین کے لقب سے مشہور تھیں۔قبیلہ بنو ہلال سے ہیں۔اُن کے باپ کا نام خزیمہ بن حرث اور ماں کا نام ہند بنت عوف تھا۔اُن کا پہلا شوہر عبداللہ بن جحش تھا۔جس کے مرنے کے بعد اُن کا نکاح ۳ھ ہجری میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہؤا۔اُس وقت اُن کی عمر ۲۹ سال کی تھی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۵۶ سال کی۔مگر وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صرف آٹھ مہینے رہ کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی زندگی میں ۴ھ ہجری میں انتقال کر گئیں اُن کی عمر اُس وقت ۳۰ سال کی تھی۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ولادت ۲۶ھ قبل ہجری میں ہوئی تھی +

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت زینب ام المساکین نے اپنا نفس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا۔مگر وہ روایتیں کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہیں۔کیونکہ جن ازواج مطہرات کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہؤا۔اور اُن کا مہر ادا کیا گیا۔اُن میں یہ بھی داخل ہیں اور اس امر پر محدثین کا اتفاق ہے +

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا۔زینبؓ جحش کی بیٹی تھیں اور اُن کی ماں کا نام اُمیمہ تھا۔اور اُمیمہ عبدالمطلب کی بیٹی اور عبداللہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ و آلہ وسلم کے والد کی بہن تھیں ۔ اس رشتہ سے حضرت زینب رضی اللہ تعالےٰ عنہا آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں۔ ان کی عمر پچاس برس کی ہوئی ۔ اور سنہ ۲۰ ہجری میں انہوں نے وفات پائی ۔ اس حساب سے ان کی ولادت سنہ ۳۰ قبل ہجری میں ہوتی ہے +

پہلی دفعہ ان کا نکاح زید بن حارثہ سے سنہ ۳ ہجری کے اخیر یا سنہ ۴ ہجری کے شروع میں ہؤا۔ جب زید نے ان کو طلاق دی۔ تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنہ ۵ ہجری میں ان سے نکاح کیا۔ اُس وقت ان کی عمر ۳۵ سال کی اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۵۸ برس کی تھی۔ چھ برس یعنی وقت وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک آپ کی زوجیت میں رہیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد انتقال کیا +

اُن کے پہلے شوہر زید کے باپ کا نام حارثہ اور اُن کے دادا کا نام شراحیل اور اُن کی ماں کا نام سُعدیٰ بنت ثعلبہ تھا۔ جو بنی معن قبیلہ بنی طے سے تھیں۔ ایام جاہلیّت میں سُعدیٰ اُن کی ماں اُن کو لیکر کہیں جاتی تھی۔ بنو قین نے رستہ میں اُن پر حملہ کیا اور زید کو پکڑ کر عکاظ کے بازار میں بیچنے کو لائے۔ اُس وقت زید کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ حکیم بن حزام نے اپنی پھوپھی خدیجہ بنت خویلد کے لئے جو سب سے پہلی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ تھیں۔ چارسو درہم پر خرید لیا ۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے زید کو آنحضرت صلّے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دے دیا ۔ اور آنحضرت صلّے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا +

اتفاقاً زید کا باپ اور چچا مکّہ میں آئے اور زید کو دیکھ کر پہچان لیا۔ اور یہ بات چاہی کہ زید کا فدیہ دیکر اُن کو اپنے ساتھ لیجاویں۔ مگر زید نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہنا پسند کیا۔ اُس وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کی رسم کے موافق زید کو اپنا متبنٰے یعنی منہ بولا بیٹا کرلیا +

بعد اس کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کا نکاح ام ایمن سے جن کی گود میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا بچپن بسر کیا تھا۔ اور اُن سے اُسامہ پیدا ہوئے۔ ام ایمن کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑے اصرار سے زید کا نکاح زینب بنت جحش سے کردیا +

زینب ایک عالی خاندان عورت تھی اُن کو یہ پسند نہیں تھا کہ ایک شخص جو درحقیقت غلام ہے۔ گو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کو آزاد کر کے متبنے کر لیا ہے۔ اس سے نکاح کریں۔ لیکن جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کرنے پر اصرار کیا۔ اور اس پر ایک آیت بھی نازل ہوئی کہ کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کے رسول نے کوئی بات مقرر کر دی ہو۔ تو پھر اُس امر میں اُن کو اختیار رہے اور جس نے خدا اور اُس کے رسول کی نافرمانی کی ایک بڑی گمراہی میں مبتلا ہوا۔ چنانچہ وہ آیت یہ ہے وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبینا تو اُس وقت زینب زید سے نکاح کرنے پر راضی ہو گئیں۔ پس یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصرار سے زینب نے زید سے نکاح کرنا قبول کیا تھا۔ اگر خود رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زینب سے نکاح کرنا منظور ہوتا تو اس قدر اصرار زید کے ساتھ نکاح کرنے میں کیوں فرماتے ✤

بعد نکاح کے زینب اور زید میں موافقت نہیں ہوئی۔ زینب اپنے شوہر کو نہایت حقیر سمجھتی تھی اور اُس سے بدزبانی کرتی تھیں اور جو کچھ وہ کہتا تھا اُس کو نہیں مانتی تھی۔ اور ایسا ہونا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ کیونکہ جو حالت زید کی تھی اور جو حالت زینب کی تھی۔ .. .. .. وہ اس بات کی مقتضی تھی کہ زینب ضرور اپنے شوہر کو حقیر اور بیوقعت سمجھے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زید زینب کی باتوں سے تنگ ہو گیا۔ اور طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ اور جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے زید کو سمجھایا اور طلاق دینے سے منع کیا۔ چنانچہ اُس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس۔ واللہ احق ان تخشاہ۔ یعنی خدا نے پیغمبر کو یاد دلایا کہ۔ جب تو زید سے جس پر خدا نے احسان کیا اور جس پر تو نے احسان کیا۔ کہتا تھا کہ اپنی جورو کو اپنے پاس رہنے دے اور خدا سے ڈر اور چھپاتا تھا اپنے دل میں اُس بات کو جس کو خدا ظاہر کرنے والا ہے اور ڈرتا تھا لوگوں سے اور خدا بہت لائق ہے کہ اُس سے ڈرے ✤

مخالفین اسلام کہتے ہیں کہ اس آیت میں امسک کا لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف دنیاداری کے طور پر بیان کیا تھا مگر اُن کے دل میں یہ بات

تھی کہ کسی طرح زید طلاق دیدے۔ تو آپ اس سے نکاح کریں۔ مگر ہم کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ کس طرح اُن لوگوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں یہ تھا کہ زید اپنی بیوی کو طلاق دے مگر ظاہرداری سے کہا کہ امسک علیک زوجک پس یہ ایک جھوٹا اتہام ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر لگایا گیا ہے +

اس آیت میں جو یہ لفظ ہیں وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ اُس کی خدا نے کچھ تشریح نہیں کی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔ اُس پر مفسرین اور اہل سیر میں سے کسی نے کسی امر کا چھپانا اور کسی نے کسی امر کا چھپانا بیان کیا اور وہ متعدد اقوال ایک نے دوسرے سے روایت کئے اور وہی متعدد روایتیں کتب تفاسیر اور سیر میں مندرج ہوئیں جو محض ایک شخص کی رائے ہونے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ اُن میں ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے مخالفین اسلام نے سند پکڑی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نکتہ چینی کی ہے۔ مگر ایسی روایتوں سے جو محض بے اصل ہیں اور راویوں کی رائے ہونے کے سوا اور کچھ وقعت نہیں رکھتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نکتہ چینی نہیں ہوسکتی۔ ہاں بلاشبہ اُن راویوں سے قطع نظر کر کے قرآن مجید کے الفاظ اور سیاق پر غور کرنا چاہئے اور جو امر کہ از روئے عقل انسانی بلا لحاظ معتقدات مذہبی قرار پائے اُس کو تسلیم کرنا چاہئے۔ اگر اُس وقت کوئی امر نکتہ چینی کے قابل ہو تو اُس پر نکتہ چینی کی جاوے۔ مگر اس امر کو کہ فلاں مفسر نے یہ کہا ہے اور فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر بنیاد نکتہ چینی قرار دینا تو محض لغو اور ناواجب ہے +

اس اخفا کی نسبت بعض لوگوں نے کہا کہ خدا تعالے نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خبر کردی تھی۔ کہ زید زینب کو طلاق دیگا۔ اور زینب تیری زوجیت میں آئیگی مگر جب زید نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کیا کہ میں زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کو طلاق دینے سے منع کیا۔ حالانکہ اُن کو خدا نے اطلاع کردی تھی کہ زید زینب کو طلاق دیگا۔ اور وہ تیری زوجیت میں آئیگی پس اسی بات کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دل میں چھپایا اور اُسی کی نسبت وتخفی فی نفسک میں اشارہ ہے +

اسی امر کو اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اور اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر ان مفسروں کا اس بات کو تسلیم کرنا کہ خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی سے مطلع کردیا تھا۔ کہ زید زینب کو طلاق دیگا۔ اور زینب تیری زوجیت میں آئیگی۔ اور تخفی

فی نفسک سے اُسی کا اخفا مراد لینا محض بے اصل ہے۔اور قرآن مجید یا قرینہ مقام سے یہ امر نہیں نکلتا۔اور نہ کبھی پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا کہ اس باب میں مجھ کو وحی ہوئی ہے۔ پس یہ ایک غلطی اُس شخص کی ہے جس نے اول اپنی رائے سے تخفی کا یہ مطلب قرار دیا ہے اور کتب تفاسیر اور سیر میں بطور روایت کے مندرج ہؤا ہے +

بعض لوگوں نے کہا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتفاقاً زینب کو سر ننگی یا نہاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اُس پر فریفتہ ہو گئے تھے۔اور تخفی فی نفسک سے اُسی فریفتگی کی طرف اشارہ ہے +

ہم چاہتے ہیں کہ چند حقیقی امر اور واقعی حالات بیان کریں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ جو مراد تخفی فی نفسک سے اوپر بیان ہوئی ہے۔وہ کسی طرح بھی صحیح ہوسکتی ہے یا نہیں؟ زینب بیٹی تھی جحش کی اور اُن کی ماں کا نام اُمیمہ تھا اور اُمیمہ بیٹی تھی عبد المطلب کی اور بہن تھیں۔ عبداللہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد کی۔پس زینبؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھیں۔آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتدائی عمر سے زینبؓ سے بخوبی واقف تھے اور ہزاروں دفعہ اسے دیکھ چکے تھے۔اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی زینبؓ کا زید سے نکاح کرنے کا باعث ہوئے تھے۔پس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا دفعتہً ان کو دیکھنا .. .. اور اُن پر فریفتہ ہوجانا کیسی لغو اور مہمل بات ہے۔کوئی ذی عقل تو اُس کو قبول نہیں کرسکتا۔اس سے ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا بیان کیسا لغو اور ناواجب ہے اور گو کہ کسی تفسیر اور سیر کی کتاب میں لکھا ہو ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔اور یہ روایت کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم زینب کو ننگا دیکھ کر فریفتہ ہو گئے تھے محض جھوٹ اور غلط ہے۔اور کسی حدیث کی معتبر کتاب میں نہیں ہے +

ان تمام واقعات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زید نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زینب کے طلاق دینے کا ذکر کیا اور باوصف سمجھانے کے زید نے نہ مانا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ضرور اس بات کی فکر ہوئی کہ زید کے طلاق دینے کے بعد زینبؓ کا کیا حال ہوگا۔اور اس وجہ سے ضرور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیال ہؤا۔کہ اگر زید طلاق دیدے تو بجز اس کے اور کچھ علاج نہیں۔کہ آپ خود اس سے نکاح کرلیں کیونکہ اول تو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم زینبؓ کا زید سے جو غلام تھا نکاح کرنے کا باعث ہوئے تھے۔اور زید کے طلاق دینے کے بعد کوئی شخص زینبؓ کو اس وجہ سے کہ وہ ایک غلام کی جورو تھیں اُس عزت اور وقار سے نہیں رکھ سکتا تھا جس عزت اور

وقار سے نہیں رکھ سکتا تھا جس عزت اور وقار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کا رہنا چاہتے تھے۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کا ڈر تھا۔ کہ عرب میں متبنے کی جورو سے نکاح کرنا معیوب تھا۔ پس اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے۔ تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ یعنی جس بات کو تو دل میں چھپاتا تھا۔ خدا اُس کو ظاہر کرنے والا تھا۔ اور پھر فرمایا تخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ یعنی تو لوگوں سے ڈرتا تھا۔ حالانکہ خدا ہی سے ڈرنا چاہیے تھا +

بعد اس کے زید نے زینب کو طلاق دی اور عدت کے دن گذر گئے۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب سے نکاح کیا۔ جس کا ذکر اس آیت میں ہے فلما قضی زیدٌ منہا وطراً زوجنا کہا لکی لا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیائہم اذا قضوا منہن وطراً وکان امر اللہ مفعولا۔ یعنی جب زید نے اُس سے اپنی حاجت پوری کر لی یعنی اُس کو طلاق دیدی اور عدت بھی پوری ہو گئی تو ہم نے اُس کو تیری زوجیت میں دیا تاکہ مسلمانوں کو اپنے لے پالک بیٹوں کی جوروؤں کے ساتھ نکاح کرنے میں کچھ تردد نہ ہو۔ جب کہ وہ بی بیاں عدت کے دن پورے کریں۔ اور خدا کا حکم تو شدنی ہے۔ عدت کے دن گذرنے کے بعد نکاح کرنا آیت مذکورہ کے الفاظ "قضی زید منہا وطراً" سے ثابت ہوتا ہے۔ اس آیت میں جو لفظ زوجنا کہا ہے۔ اُس پر لوگوں نے قیاس دوڑایا۔ کہ نکاح کی نسبت جو خدا نے اپنے ساتھ کی ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ خود خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زینب کے ساتھ نکاح کر دیا۔ اور جب کہ خدا آسمانوں پر رہتا ہے تو وہ نکاح آسمانوں پر خدا نے کیا ہوگا۔ اور خدا اور جبرائیل اُس کے گواہ ہوئے ہونگے۔ اس قیاس پر اور بہت سی غلط اور جھوٹی باتیں زیادہ ہوتی گئیں۔ اور اُن کو ایک نے دوسرے سے روایت کیا اور بطور ایک روایت کے کتب تفاسیر و سیر میں مندرج ہوئیں اور مخالفین مذہب اسلام نے اُن کو بنیاد نکتہ چینی قرار دیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نکتہ چینی شروع کی۔ مگر جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ایسی مہمل روایتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نکتہ چینی کی بنیاد نہیں ہوسکتیں +

تمام روایتوں میں مندرج ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نکاح کا ولیمہ نہایت عمدہ طور سے دیا تھا اور یہ دلیل اس بات کی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسب دستور بعد طلاق زید کے زینبؓ سے نکاح کیا تھا۔ پس جن لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر نکاح کے زینبؓ سے مقاربت

کی تھی وہ سراسر غلط فہمی پر ہیں اور غالباً یہ خیال اُن کے دل میں لفظ زوجنا کہ سے پیدا ہُوا ہے۔ جس سے آسمانوں پر نکاح ہو جانے کا خیال سمجھا گیا تھا۔ مگر یہ دونوں خیال محض غلط ہیں اسی لئے کہ خدا تعالے نے ہزاروں جگہ قرآن مجید میں بندوں کے افعال کو بہ سبب علۃ العلل ہونے کے اپنی طرف منسوب کیا ہے اور اُس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ فعل بندوں نے نہیں کئے +

کسی کو متبنٰے کر لینے یعنی منہ بولا بیٹا بنا لینے سے درحقیقت وہ صُلبی بیٹا نہیں ہو جاتا۔ اور نہ متبنٰے کر لینے والا حقیقی باپ ہو جاتا ہے۔ پس جو حکم کہ صلبی بیٹے کی زوجہ سے متعلق ہے وہ اُس کی زوجہ سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ یہ رسم جو خلاف واقعی حالت کے عرب جاہلیت میں جاری تھی۔ اُس کا معدوم کرنا نہایت مناسب اور ضرور تھا جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے "لکیلا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیائھم اذا قضوا منھن وطراً" اور اس امر کے صاف طور پر ظاہر ہو جانے کے لئے خدا نے فرمایا۔ ما کان محمد ابا احدٍ من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔ یعنی محمد تم سے کسی شخص کے باپ نہیں ہیں۔ مگر وہ خدا کے رسول اور انبیا کے خاتم ہیں یعنی اُن کے بعد اور کوئی نبی نہیں ہونے کا +

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ متبنٰے کو اُس کا بیٹا کہکر پکارتے تھے جس نے اُس کو متبنٰے کیا ہو اور اُس سے شبہ پڑتا تھا کہ وہ اُس کا صلبی بیٹا ہے۔ اس بات کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کر دیا کہ جو درحقیقت کسی کا صلبی بیٹا نہیں ہے اُس کو اُس کا بیٹا کہکر مت پکارو۔ بلکہ اُس کا بیٹا کہکر پکارو جس کا وہ درحقیقت وہ صلبی بیٹا ہے اور جس آیت میں حکم ہے وہ یہ ہے۔ وما جعل ادعیاءکم ابناءکم ذالکم قولکم بافواھکم واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ادعوھم لاباءھم ھو اقسط عند اللہ فان لم تعلموا اباءھم فاخوانکم فی الدین و موالیکم یعنی خدا نے تمہارے مُنہ بولے بیٹوں کو تمہارا صلبی بیٹا نہیں بنایا یہ تمہارا کہنا ہی کہنا ہے اور خدا سچی بات کہتا ہے۔ اور وہ سیدھا راستہ بتاتا ہے۔ اُن کو اُن کے باپوں کے نام سے پکارو۔ خدا کے نزدیک یہی بہت ٹھیک ہے پھر اگر تم اُن کے باپوں کو نہیں جانتے تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے موالی ہیں +

اگر یہ کہا جائے کہ مُنہ بولا بیٹا کہنے سے وہ بمنزلہ صلبی بیٹے کے نہیں ہو جاتا۔ اور اسی لئے اس کی زوجہ سے جب وہ اُس کو طلاق دیدے نکاح جائز ہے تو آنحضرت صلّی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی ازواج سے جو وہ بھی بمنزلہ منہ بولی ماں کے ہیں کیوں نکاح حرام ہوا۔ مگر اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بہ سبب اس کے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کو ماں کہا گیا ہے۔ اُن سے نکاح جائز نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کو محرمات میں داخل کر دیا ہے۔ اور جس کی وجہ اصلی ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اور بہ سبب اُن کے محرمات میں داخل ہونے کے اُن پر اُمّہات کا لفظ بولا گیا ہے نہ یہ کہ اُمّہات کہنے سے وہ حرام ہو گئیں ہیں۔ پس اُمّہات کہنے سے اور اُن سے نکاح حرام ہونے سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ محرمات میں تھیں اس لئے امہات کا لفظ بولا گیا ہے +

قوم کی زندگی اور موت

یہ مضمون رسالہ معارف علی گڈھ سے لیا گیا ہے اس کے اڈیٹر جناب مولوی سید وحید الدین صاحب تسلیم - سابق لٹریری اسسٹنٹ سرسید جو اس وقت جامعۂ عثمانیہ کے اساتذہ میں داخل ہیں - لکھتے ہیں - کہ یہ مضمون سرسید مرحوم نے وفات سے ایک مہینہ پہلے لکھنا شروع کیا تھا - مگر ہجوم اشتغال کے سبب اُس کے پورا کرنے کی نوبت نہیں آئی معلوم نہیں کہ تاریخی حصۂ مضمون کے بعد کیا خیالات لکھے جاتے اور کیا عنوان اس مضمون کا قائم ہوتا - سرسید مرحوم اکثر مضامین کے عنوان ان کے ختم ہونے پر لکھا کرتے تھے - اس مضمون کا عنوان میں نے قائم کیا ہے اور اُس کو بجنسہ اسی ناتمام حالت میں چھپواتا ہوں جس میں کہ وہ میرے پاس سرسید مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے - امید ہے کہ ناظرین غور سے پڑھینگے ۔ (احمد بابا مخدومی)

ہر ایک قوم کی ترقی ۔ عروج اور نام آوری کی ایک عمر ہوتی ہے جس طرح کہ ایک انسان کی - انسان پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے، بڈھا ہوتا ہے اور اخیر کو مرجاتا ہے اُس کے بڑھنے جوان ہونے بڈھا ہونے مرنے کے طبعی اسباب ہوتے ہیں - جو کسی کے روکے سے رُک نہیں سکتے اسی طرح ایک وحشی قوم ترقی کرتی ہے نام آور ہوتی ہے، عروج پر پہنچ جاتی ہے، پھر تنزل شروع کرتی ہے، بڑھاپا اُس آجاتا ہے اور پھر ایسی گمنام ہوجاتی ہے کہ اُس پر موت کا اطلاق ہوتا ہے ۔

قوم کا تنزل ایک طبعی امر ہے جس طرح انسان کا بڈھا ہونا طبعی امر ہے - بڑھاپے کے امراض کو لوگ جانتے اور پہچانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مرض ہے مگر نہ اُس کی دوا ہو سکتی ہے اور نہ وہ جا سکتے ہیں کیونکہ وہ طبعی ہوتے ہیں اور طبیعت بدلتی نہیں - جو لوگ قوم کے خیر خواہ ہوتے ہیں وہ اُن مرضوں کی تشخیص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُن کا علاج ممکن ہے اور نہایت کوشش سے اُس کے علاج پر متوجہ ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہمارے ہی قصور اور غفلت سے یہ مرض لگ گئے ہیں - مگر درحقیقت یہ بات یوں نہیں ہوتی - بلکہ قوم کی طبیعت ہی ایسی ہوجاتی ہے کہ وہ امراض جو باعث تنزل ہیں خود قوم کی طبیعت بن جاتے ہیں اور اس لئے علاج پذیر نہیں ہوتے ۔

عرب کی وحشیانہ حالت سے ترقی کی پہلی سیڑھی تمدنی حالت کی طرف مائل ہونا

تھی۔ اُن لوگوں نے جو خانہ بدوش پھرتے تھے مختلف مقامات پر سکونت اختیار کی اور توالد و تناسل سے آبادی کی کثرت ہوتی گئی۔ اُن کے تمدنی تعلقات صرف اسی گروہ میں محدود تھے جو ایک جگہ آباد تھی ہر ایک گروہ دوسرے گروہ سے اس طرح علیحدہ رہتے تھے جیسے مختلف قسم کے جانور کہ باوجود ایک میدان میں رہنے کے ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے ہیں۔ اس تفرق کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایک گروہ کے لئے جدا جدا نام اور لقب قائم ہوں تاکہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے ملنے نہ پاوے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے معبود کو پسند نہ کرے بلکہ اپنے اپنے لئے جدا جدا معبود قرار دے۔ ایک دوسرے پر غلبہ اور تفوق کی کوشش کرے اور ہر گروہوں میں ہمیشہ جنگ و جدل و بغض و عداوت قائم رہے۔

عرب کی یہی حالت تھی۔ کہ جب اُس نے ترقی شروع کی تھی اور گویہ سب باتیں ترقی کے موانع میں سے تھیں۔ لیکن زوال پذیر تھیں۔ کیونکہ قوت نمو موجود تھی اور وہ ان سب موانع کو دور کرسکتی تھی جیسے کہ ایک بچے کی قوت نمو اُس کے ضعف کو اور اُن امراض کو جو طبعی طور پر بچپن میں لاحق ہوتے ہیں دور کرتی ہے مگر جب یہی امراض کسی قوم میں ترقی کے بعد لاحق ہوتے ہیں۔ تو وہ زوال پذیر نہیں ہوتے جیسے کہ بچپن کے زمانہ کے امراض بڑھاپے میں لاحق ہونے سے جا نہیں سکتے۔

اُن کی قوت نمو کچھ نہ کچھ ان امراض کو دور کرتی جاتی تھی اور وہ ایک دوسرے کے حلیف ہونے لگے تھے مگر اُن میں ایک ایسی ہی قوت نمو کی ضرورت تھی۔ جو ان سب مرضوں کو دفعتہً دور کردے۔ وہ زمانہ آیا اور حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ فَاتَّبِعُوْنِیْ کل قومیں اُس کلمہ کی مخالفت میں متحد ہوگئیں اور یہی اتحاد گو کہ مخالفت میں تھا اُس قوی قوت نمو کے پیدا ہونے یا موجود ہونے کی بشارت دیتا تھا۔ تمام مختلف امراض جو قوموں میں تھے اُس کے مقابل مضمحل ہوگئے یا معدوم یا قریب معدوم ہونے کے پہنچ گئے صرف ایک مرض شدید "لا نسلم انت رسول اللہ" کل قوموں میں پھیلا ہوا رہ گیا۔ تائید الٰہی اور نصرت سماوی نے یا یوں کہو کہ سچ کے طبعی اثر نے یا نمو کی طبعی قوت نے اُس مرض کو دور کیا اور سب نے کہا "نشہد انت رسول اللہ نتبعک" دفعتاً تمام موانع ترقی دور ہوگئے: قوت نمو اپنی پوری قوت سے اپنا کام کرنے لگی۔ سب کا معبود ایک ہوگیا۔ تمام اختلافات دور ہوگئے۔ عداوتیں مٹ گئیں۔ آپس کی لڑائیاں موقوف ہوگئیں۔ دینی اور دنیاوی سرداری نے ایک مرکز پر قرار پایا اور تفوق کی مخالفانہ خواہشیں جو ایک کو دوسرے کے ساتھ تھیں، جاتی رہیں۔ اور برخلاف اُس کے

اطاعت اور محبت اور اتفاق اور ہمدردی میں تفوق حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ تمام مختلف گروہیں ایک قوم ہوگئیں۔ قومیت کا اصول جو نسل پر محدود تھا وسیع ہو گیا۔ اور جس نے کہا "اشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمد الرسول اللہ" کسی نسل کا تھا اُسی ایک قوم کا ہو گیا "کما قال اللہ تعالے انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون" قوم قوم ہو گئی۔ جوانی میں بھرپور ہو گئی، ترقی اور عروج کے اعلےٰ درجہ پر پہنچ گئی۔ خدا نے بھی اُس پر اپنا بڑا احسان جتایا اور فرمایا "ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمومنین الف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم انہ عزیز حکیم"۔ افسوس کہ یہ جوانی کی عمر صرف دس برس رہی اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ہی وہ امراض شروع ہوئے جو جوانی کی حالت میں شروع ہوتے ہیں اور جوانی کی قوت اُن کو دفع کرتی ہے۔ اور اپنی قوت کو قائم رکھتی ہے۔

رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ حیات میں کسی کو کسی قسم کے تفوق کا خیال نہ تھا۔ مگر انتقال ہوتے ہی یہ خیال پیدا ہوا۔ ہم دل سے قبول کر لینگے کہ وہ خالصاً للہ تھا۔ اور دنیاوی کچھ لگاؤ اس میں نہ تھا۔ مگر وہ وجود میں آیا۔ اُس کا وجود میں آنا ایک طبعی امر تھا۔ مگر قوم کی جوانی بھرپور تھی۔ اُس نے کچھ زیادہ اثر نہیں کیا۔ تھوڑی سی حرارت ہو کر جاتی رہی۔ مگر بیماری نے گھر دیکھ لیا۔

گو اس بیماری نے اُس وقت کچھ اثر نہیں کیا۔ مگر اُس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ رفتہ رفتہ اپنا کام کرتی رہی چنانچہ حضرت عثمانؓ کی شہادت۔ جنگ جمل اور جنگ صفین۔ شہادت حضرت علی مرتضےٰؓ۔ ترک خلافت حضرت امام حسنؓ۔ شہادت حضرت امام حسین حرمین کے واقعات دردآلود سب اُسی بیماری کے نتائج میں سے تھے۔

سب سے بڑا نشان قومی تنزل کا حکومت یا سلطنت کا تقسیم ہو جانا ہے۔ حضرت علی مرتضےٰ اور معاویہ بن ابوسفیان۔ امام حسن علیہ السلام نے کمال دانائی و بردباری اور عالی ہمتی اور قومی ہمدردی سے اس کو مٹایا اور ترک خلافت کیا۔ مگر حضرت عبد اللہ ابن زبیر نے حجاز میں مستقل حکومت قائم کرنے سے پھر اُس علامت کو تازہ کیا۔ مگر تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا۔ کہ عبد الملک ابن مروان نے اس حکومت کو برباد کر دیا۔ عبد اللہ ابن زبیر بھی شہید ہوئے اور پھر کل سلطنت اسلامیہ کا مدار ایک مرکز پر جمع ہو گیا اور عروج جیسا کہ تھا پھر قائم ہوا۔ گو بنی امیہ کی سلطنت بھی بنی فاطمہ علیہا السلام اور علویوں اور عباسیوں کے اندیشہ سے خالی نہ تھی

مگروہ ایسی مستحکم تھی کہ ایک زمانہ تک کوئی شخص اُس کو ہلا نہ سکا +

مگر عباسی اپنی دھیمی اور دور اندیش اور خاموش تدبیریں میں کامیاب ہوئے بنی امیہ کو اُنھوں نے نکالا۔ اور خود سلطنت حاصل کی مگر پوری قوت ایک مرکز پر قائم نہ رہی۔ بنی امیہ کے خاندان کا ایک شخص عبدالرحمٰن اندلس میں جا پہنچا اور وہاں ایک مستقل جداگانہ سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اور سلطنت اسلامیہ دو ٹکڑے ہوگئی۔ بااین ہمہ عباسیوں کے وقت میں مسلمانی سلطنت غایت درجہ کمال پر ترقی کر گئی تھی۔ مگر عیش وعشرت اور مظالم بھی خصوصاً سادات پر اپنے درجۂ کمال پر پہنچ گئے تھے عہد جوانی ختم ہوگیا تھا۔ اور مطابق قانون طبعی کے بڑھاپے کا زمانہ شروع ہونے والا تھا۔ وہ آموجود ہوا اور کسی تدبیر سے نہیں رُکا۔ سلطنت کے ٹکڑے ہونے شروع ہوئے۔ پھر ادریس نے ایک مغربی سلطنت قائم کی اور برابرہ اور مغیلہ اور زناتہ اس سے شریک ہوگئے۔ پھر شیعوں نے خروج شروع کیا اور کتامہ اور صنہاجہ کی مدد سے مغرب اور افریقہ میں ایک اور سلطنت قائم کی اور مصر اور شام اور حجاز پر بھی قبضہ کر لیا اور ادریسیوں کو برباد کر دیا۔ اب تین مسلمانی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ ایک عباسیوں کی دوسری بنی امیہ مجددین کی اندلس میں اور عبیدیین کی افریقہ اور مصر اور شام اور حجاز میں +

بعد اس کے عباسیوں کی سلطنت کے اور بھی ٹکڑے ہوگئے۔ سامانیوں نے خراسان اور ماوراءالنہر میں سلطنت قائم کی۔ علویین نے دیلم وطبرستان میں۔ یہاں تک انہوں نے عراقین اور بغداد پر بھی قبضہ کر لیا پھر سلجوقی اُٹھے اور انھوں نے ان سب کو مار ہٹایا۔ مگر پھر اُن کی سلطنت کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ اسی طرح سلطنت مغاربہ پر جو صنہاجہ اور افریقہ میں تھی۔ باویس کے عہد میں اس کے چچا حماد نے خروج کیا۔ اور سلطنت کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ موحدین کی سلطنت کا بھی جو افریقہ میں تھی یہی حال ہوا۔ بنو ابی حفص نے خروج کیا۔ انھوں نے ملک دبا لیا اور ایک سلطنت قائم کر دی۔ اسی طرح تمام افریقہ کے ٹکڑے پر جُدا جُدا سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ اور مجموعی طاقت جو مسلمانی سلطنت کی تھی۔ ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ ہوگئی +

وہّابی اہل حدیث یا مُتّبع حدیث

ہم تو اس بات کی کہ لوگوں نے کسی کا کیا نام رکھا ہے کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ جو شخص کسی کو بُرے نام سے پکارتا ہے۔ وہ خود آپ اپنی حقارت کرتا ہے۔ یہودی حضرت عیسٰے علیہ السلام کو بطور حقارت کے (نعوذ باللہ منہا) نزارین یا ناصری منسوب بقصبۂ ناصرہ کہتے تھے۔ مگر اس سے کیا حضرت عیسٰے علیہ السلام کی شان میں کچھ بٹہ لگتا تھا؟ بلکہ اُنہی کا مُنہ کالا کرنا ہوتا تھا۔ جو اس طرح بنظر حقارت حضرت عیسٰے علیہ السلام کا نام لیتے تھے۔ اِسی طرح جن لوگوں نے مسلمان نیک بندوں متّبع سنّت کا نام بطور حقارت کے وہابی نام رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی حقارت کی تھی۔ نہ اُن بزرگوں کی جن کا اور اُن کے پیروؤں کا یہ نام رکھا تھا +

مگر جناب مولانا مولوی ابو سعید محمد حسین کو وہابی نام ہونا گوارا نہ تھا۔ اُنہوں نے گورنمنٹ سے درخواست کی تھی کہ اُس فرقے کو جو درحقیقت اہل حدیث ہے۔ اور لوگوں نے ازراہ ضد و حقارت کے اُس کا نام وہابی رکھ دیا ہے۔ گورنمنٹ اُس کو وہابی کے نام سے مخاطب نہ کرے +

مولوی ابو سعید محمد حسین صاحب کو اس نام کے گوارا نہ ہونے کی ایک معقول وجہ بھی تھی۔ اُن واقعات کے سبب سے جو اسماعیل پسر عبد الوہاب کے زمانے میں حجاز میں گزرے تھے۔ جو اپنے باپ عبد الوہاب کے مسائل کا معتقد تھا۔ جس کی طرف اس فرقے کو منسوب کیا جاتا ہے۔ اُن واقعات کے سبب سے سلطان ٹرکی اُس فرقے کو مخالف بھی سمجھتا تھا۔ وہی خیال ترکوں کا بذریعہ اُن تاریخوں کے جو انگریزی زبان میں وہابیوں کے حالات میں تحریر ہوئیں ہندوستان کے انگریزوں میں آیا۔ اور بعض واقعاتِ مشتبہ جو ہندوستان کی سرحد پر گذرے۔ اُن سے اس خیال کو زیادہ تقویت ہوگئی۔ اور اِن اسباب سے وہابی کے لفظ میں ایک مفہوم مخالف سلطنت ہونا بطور ایک جُزو اُس کے معنوں کے سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ یہ خیال محض غلط تھا وہابیت کو سلطنت کی مخالفت سے کچھ تعلّق نہ تھا۔ اور بلا شُبہ گورنمنٹ کی طرف سے کسی فرقے کی نسبت ایسے لفظ کا اِستعمال کرنا جس کے معنی میں مفہوم مخالف سلطنت شامل ہوگیا ہو۔ مناسب نہ تھا۔ اور مولوی محمد حسین صاحب کو اُس کو گوارا نہ کرنا نہایت بجا تھا۔ ہم کو امید ہے کہ وہ فرقہ جس کو لوگ وہابی کہتے ہیں۔ اور جو اپنے عقائد اور مسائل مذہب میں نہایت سخت اور بہت پختہ ہے۔ اور خدائے واحد کے سوا ظاہرًا و باطنًا وحیلۃً و صریحۃً اور کسی طرف التجا نہیں کرتا۔ وہ اس مسئلے پر بھی نہایت پختہ ہے کہ جس سلطنت میں وہ لوگ بطور رعیّت کے رہتے ہیں

کبھی اُس سلطنت سے مخالفت نہیں کرسکتے۔ خواہ وہ سلطنت عیسائیوں کی ہو۔ یا یہودیوں کی۔ یا بت پرستوں کی۔ یہاں تک کہ اگر اُس سلطنت میں مذہبی آزادی نہ ہو۔ تو اُس سلطنت سے اُن کو ہجرت کرجانا لازم ہوتا ہے۔ مگر مخالفت کرنا جائز نہیں ہوتا۔ انگلش گورنمنٹ ہندوستان میں خود اُس فرقے کے لئے جو وہابی کہلاتا ہے ایک رحمت ہے۔ جس طرح ہندوستان میں کُل مذاہب کے لوگوں کو کامل مذہبی آزادی ہے۔ جو سلطنتیں اسلامی کہلاتی ہیں۔ اُن میں بھی وہابیوں کو ایسی آزادیٔ مذہب ملنا دشوار۔ بلکہ ناممکن ہے۔ سلطان کی عملداری میں وہابی رہنا مشکل ہے۔ اور مکہ معظمہ میں تو اگر کوئی کسی کو جھوٹ موٹ بھی وہابی کہدے۔ تو اُسی وقت جیل خانے یا حوالات میں بھیجا جاتا ہے۔ گو وہ کیسا ہی مقدس اور نیک مولوی ہو یا سی۔ ایس۔ آئی۔ پس وہابی جس آزادیٔ مذہب سے انگلش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں رہتے ہیں۔ دوسری جگہ اُن کو میسر نہیں۔ ہندوستان اُن کے لئے دارالامن ہے۔ پس وہابیوں کی نسبت یہ خیال کہ اُن کا سلطنت کے مخالف ہونا لازمی ہے۔ ایک غلط خیال تھا۔ اور تمام مسلمانوں کو مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ اُنہوں نے اس غلط خیال کے دور کرنے میں کوشش کی۔ اور سب سے زیادہ انگلش گورنمنٹ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ کہ اُس نے مولوی ابوسعید محمد حسین کی کوششوں کو منظور کیا۔

غرض کہ مولوی محمد حسین کی کوشش سے گورنمنٹ نے منظور کرلیا کہ آیندہ سے گورنمنٹ کی تحریرات میں اُس فرقے کو وہابی کے نام سے تعبیر نہ کیا جاوے۔ بلکہ اہل حدیث کے نام سے جس نام کا وہ فرقہ اپنے تئیں مستحق سمجھتا ہے۔ موسوم کیا جاوے۔ جو احکام کہ اس بارے میں گورنمنٹ سے صادر ہوئے ہیں ذیل میں مندرج ہیں[1]۔

(منقول از علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ۔ ۲۔ فروری ۱۸۸۹ء)

[1] اس کتاب میں اُن کے درج کرنے کی نہ ضرورت ہے نہ گنجایش۔ (احمد مخدومی)

فہرست کتب

تہذیب الاخلاق جلد اوّل

یعنی عالیجناب نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی صاحب منیر نواز جنگ مصنف کتاب آیات بیّنات وغیرہ کے کل مضامین مندرجہ تہذیب الاخلاق گذشتہ ہفت سالہ از ابتدائے ۱۲۸۷ھ ہجری لغایت ۱۲۹۳ھ یہ مضامین ہیں. جنہوں نے مسلمانوں میں اپنی صداقت سے ایک غیر معمولی ترقی کا جوش پھیلایا - اور یہ وہی مضامین ہیں جنکی تلاش ایک مدت سے خیر خواہان قوم و ملک کو تھی مگر افسوس کہ ان کو میسر نہ آئے - اب ہم نے نہایت کوشش سے بہم پہنچا کر شائع کر دیئے ہیں - بہت عمدہ ڈمی کاغذ پر چھپی ہوئی کتاب ہے اور اس میں ۷۳ نہایت دلچسپ مضامین ہیں - اگر اگر کوئی شخص اسلام سے واقفیت حاصل کرنی چاہئے یا انشا پردازی اور معلومات کا ذخیرہ جمع کرنا چاہئے تو اس سے بہتر اور کوئی کتاب اس کو نہ ملیگی ضخامت ۴۰۰ صفحے قیمت ... ۸ر

تہذیب الاخلاق جلد دوم

عالیجناب آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں صاحب مرحوم و مغفور کے گذشتہ ہفت سالہ تہذیب الاخلاق کے مضامین جن کی قوم کو از حد ضرورت تھی از ابتدائے ۱۲۸۷ھ ہجری لغایت ۱۲۹۳ھ ہجری چھپ کر تیار ہو گئے ہیں - اس میں سر سیّد کے وہ مضامین ہیں جن کے پڑھنے سے ایک قسم کی روشنی پیدا ہوتی ہے - تعداد میں یہ مضامین ایک کم سو ہیں - اخلاقی اور تمدّنی مضامین کا مخزن ہیں - اسلامی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایک کورس مضامین نگاری کے لئے اتالیق - اردو لٹریچر کی جان - یہ وہی دلچسپ مضامین ہیں جن کی مقبولیت سے سر سیّد کو کامیابی ہوئی - یہ وہی سچے اور بے لوث آرٹیکل ہیں جنہوں نے سر سیّد کا بول بالا کیا مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا - اسلام اور اسلامی ہمدردی کا سبق دیا - ان مضامین کے پڑھنے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ اصلاح قوم میں سر سیّد کو کس قدر رکاوٹیں پیش آئیں ہیں مفصّل حالات کتاب کے پڑھنے سے آپکو معلوم ہونگے - اہل ملک کو عموماً اور اہل اسلام کو خصوصاً اس کتاب کے مطالعہ کی کہاں تک ضرورت ہے - یہ امر کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو جاویگا - کتاب بڑی ہے ۶۳۲ صفحے پر نہایت خوشخط اور عمدہ کاغذ پر چھپ کر تیار ہے قیمت ... ۸ر

المشتہر

اللہ والے کی قومی دکان مالک ملک چنن الدین خلف ملک فضل الدین نقشبندی مجددی ککے زئی تاجر کتب قومی بازار کشمیری لاہور